RAJESH KHANNA (1973–2012)

راجیش کھنہ

جنہوں نے ان گنت دلوں پر راج کیا

تحسین تبسم

پہلی قسط

19 رجولائی 2012ء کو بھارت سمیت دنیا کے بہت سے ملکوں کے اخبارات میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی:

ماضی کے نہایت مقبول و معروف فلمی ہیرو راجیش کھنہ گزشتہ روز 69 سال کی عمر میں، ممبئی میں انتقال کر گئے۔ وہ کافی عرصے سے علیل تھے۔ ان کے لواحقین میں ان کی اہلیہ ڈمپل کپاڈیا اور دو بیٹیاں ٹوئنکل اور رنکل کھنہ شامل ہیں۔ بیوی سے ان کی کئی سال قبل علیحدگی ہو چکی تھی جبکہ ان کی صاحبزادی ٹوئنکل معروف اداکار اکشے کمار سے بیاہی ہوئی ہیں۔ راجیش کھنہ کی آخری رسوم کے سلسلے میں ان کے تمام قریبی اعزا و اقارب، باندرہ میں واقع ان کی قیام گاہ پر جمع ہو چکے ہیں۔ واضح رہے کہ راجیش کھنہ کو 1969ء سے 1972ء کے درمیان ان کی مسلسل 15 فلموں کی شاندار کامیابی کے بعد بولی وڈ کے پہلے سپر اسٹار کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ مردوں، عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں، سبھی میں یکساں طور پر مقبول تھے اور انہیں بجا طور پر سینما اسکرین کا جادوگر قرار دیا جاتا تھا۔ گو کہ وہ ایک طویل عرصے سے گوشہ نشین تھے لیکن فلمی شائقین پر ان کی شخصیت کا سحر آج بھی قائم تھا اور یہ سحر نہ جانے کب تک قائم رہے۔

☆......☆......☆

اس میں شک نہیں کہ اس خبر سے بولی وڈ میں صف ماتم بچھ گئی تھی اور بھارت سمیت دنیا بھر میں راجیش کھنہ کے ان گنت مداح سوگوار ہو گئے تھے۔ تمام ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا پر اسی خبر کا چرچا تھا۔ حالانکہ ان کی موت کی خبر کچھ ایسی غیر متوقع بھی نہیں تھی کیونکہ وہ کافی عرصے سے ایک مہلک بیماری، کینسر میں مبتلا تھے اور ان کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس کے باوجود ان کی موت کی خبر سے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو دھچکا سا لگا۔ شاید اس لیے کہ کوئی بھی شخص جب راجیش کھنہ کی اس زندگی کا تصور کرتا تھا جو انہوں نے فلم کے پردے پر گزاری، ان کرداروں کے بارے میں سوچتا تھا جو انہوں نے سینما اسکرین پر ادا کیے، اس عروج کے بارے میں سوچتا تھا جو انہیں فلمی دنیا میں حاصل ہوا، تو وہ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے راجیش کھنہ لافانی ہیں، انہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔

بہت سے سپر اسٹارز...... خاص طور پر فلمی اسٹارز کے بارے میں ان کے مداح کچھ ایسا ہی محسوس کرنے لگتے ہیں لیکن پھر ایک نہ ایک دن ایسے سپر اسٹارز کی موت کی خبر بھی آجاتی ہے اور تب انسان کو یاد آتا ہے کہ اس دنیا میں تو سبھی فانی ہیں، اسٹار ہو یا سپر اسٹار، طاقتور ہو یا کمزور، عام آدمی ہو یا خاص آدمی، ہر ایک کو کسی نہ کسی روز اس دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔ شوبز کے لوگوں اور بہت سے دوسرے مشاہیر کو البتہ یہ فوقیت حاصل ہے کہ ان کے چلتے پھرتے عکس کسی نہ کسی صورت میں سالہا سال کے لیے اس دنیا میں محفوظ رہ جاتے ہیں اور مدتوں ان کی یاد دلاتے رہتے ہیں جبکہ عام اور گمنام سا آدمی آج رزقِ خاک ہوتا تو چار دن بعد اس کے لواحقین بھی اسے بھول جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ راجیش کھنہ کا عروج مثالی اور قابل رشک تھا۔ بے شمار لوگ تو ایسے عروج کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کوئی زمانہ تھا کہ کہیں ان کی موجودگی کی خبر پھیل جاتی تھی تو اتنے مداح جمع ہو جاتے تھے کہ پولیس کے لیے بھی ہجوم کو قابو میں رکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر لڑکیاں تو ان کی ایک جھلک دیکھ کر ہسٹیریائی یا مجنونانہ سی کیفیت کا شکار ہو جاتی تھیں۔ بے شمار لڑکیاں راجیش کھنہ کو اپنے خون سے خط لکھتی تھیں، انہیں اپنی محبت کا یقین دلاتی تھیں جو دیوانگی کی حد کو پہنچ چکی ہوتی تھی۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں راجیش کھنہ کو یہ بھی یقین دلاتی تھیں کہ ان کے ایک اشارے پر وہ جان دے سکتی ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے نہ جانے کتنے نوجوانوں کا آئیڈیل راجیش کھنہ تھے۔

ان کے انتقال کے وقت تک ان کے عروج کے قصے پرانے ہو چلے تھے۔ ایک عرصے سے وہ شاذ و نادر ہی کہیں دکھائی دیتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا جنازہ کسی بادشاہ کے جنازے سے کم نہیں تھا۔ ان کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے عوام و خواص کا ایک سیلاب امنڈ آیا تھا حالانکہ اس وقت بارش ہو رہی تھی لیکن اس بارش نے گویا لوگوں کی تعداد کم کرنے کے بجائے بڑھا دی تھی اور فضا کی سوگواری میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بادل برس نہیں رہے تھے بلکہ راجیش کھنہ کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ جنازے کا جلوس گزرنے کے لیے پولیس نے خاص طور پر راستے خالی کرا دیئے تھے۔

جنازے میں شامل عمر رسیدہ افراد زیادہ افسردہ اور دل شکستہ دکھائی دے رہے تھے۔ شاید اس زمانے کی یادیں ان کے دلوں پر قیامت ڈھا رہی تھیں جب وہ نوجوان راجیش کھنہ کو سینما کے پردے پر نہ جانے کس کس انداز سے اپنی محبوبہ سے اظہار محبت کرتے دیکھتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان ہستیوں کی یاد ان کے دلوں میں چٹکیاں لینے لگتی تھی جن سے وہ خود محبت کرتے تھے۔ راجیش کھنہ کی فرضی محبتوں کی کہانیوں میں عام لوگ اپنی محبت کی حقیقی کہانیوں کا انجام اور اپنے خوابوں کی تعبیریں تلاش کرتے تھے۔ شاید انہیں یہ احساس بھی ستا رہا ہو کہ راجیش کھنہ کی طرح اب ان کی زندگی کے وہ لمحے، ان کی جوانی کی وہ گھڑیاں بھی اب واپس نہیں آئیں گی۔ راجیش کھنہ کے جنازے میں فلمی دنیا کے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن عوام کا بلاشبہ ایک سیلاب تھا۔

جنازے میں شامل ایک عمر رسیدہ سکھ سے پوچھا گیا ”آپ راجیش کھنہ کے جنازے میں شرکت کے لیے کیوں آئے؟ کیا آپ انہیں جانتے تھے؟“

”ذاتی طور پر تو میں انہیں نہیں جانتا تھا لیکن مجھے لگتا یہی ہے جیسے وہ میرے جوانی کے زمانے کے دوست تھے۔ جوانی میں جب بھی اپنی محبت کی کہانی یا جدوجہد زندگانی میں اداسی کے لمحے آتے تھے تو ہم راجیش کھنہ کی فلم دیکھنے پہنچ جاتے تھے اور اپنی اداسی کو بھول جاتے تھے۔ دل میں ایک نئی امید کا چراغ روشن ہو جاتا تھا۔ اس ناتے راجیش کھنہ میرا پرانا دوست تھا۔ میں اسے الوداع کہنے آیا ہوں۔“ سکھ نے افسردہ سے لہجے میں جو جواب دیا، اس کا مفہوم کم و بیش یہی تھا۔

ایک عمر رسیدہ بنگالی خاتون سے جب پوچھا گیا کہ وہ راجیش کھنہ کے جنازے میں شرکت کے لیے کیوں آئی ہیں، تو وہ افق کی طرف دیکھ کر گویا ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے اٹک اٹک کر، دھیمی آواز میں بولیں ”آپ نہیں سمجھ سکتے کہ راجیش کھنہ میرے لیے کیا تھا۔ اب تو وقت بدل گیا ہے لیکن کوئی زمانہ تھا جب تقریباً ہر نوجوان لڑکی کے لیے راجیش کھنہ کی فلم دیکھنے کے لیے جانا ایسا ہی تھا جیسے وہ راجیش کھنہ کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی ہو۔ راجیش کھنہ فلم کے پردے پر خواہ کسی بھی ہیروئن کے ساتھ رومانس کر رہا ہوتا لیکن کم از کم میں یہی محسوس کرتی جیسے وہ میرے ساتھ اظہار عشق کر رہا ہے اور میری محبت میں گرفتار ہے۔“

اس طرح کی باتوں سے شاید وہ لوگ بھی راجیش کھنہ کی مقبولیت کا کسی حد تک اندازہ کر سکیں جنہوں نے ان کے عروج کا دور نہیں دیکھا۔ راجیش کھنہ نے جیسا عروج دیکھا، ویسا ہی ان پر زوال بھی آیا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ در حقیقت امیتابھ بچن نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ امیتابھ بچن نے جس وقت بولی وڈ میں قدم رکھا، راجیش کھنہ اس وقت جانے مانے ہوئے اسٹار تھے۔ پھر یوں ہوا کہ جوں جوں امیتابھ بچن شہرت و مقبولیت کے راستے پر آگے بڑھتے رہے، ہرجائی وقت دھیرے دھیرے راجیش کھنہ کو پس منظر میں دھکیلتا رہا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب ڈائرکٹرز اور پروڈیوسرز کے لیے راجیش کھنہ گویا بھولی بسری کہانی ہو گئے۔

عروج کے زمانے میں ان کی عجیب و غریب عادت، سنکی پن، تکبر اور بدمزاجی کے بھی چرچے رہے۔ بتدریج زوال آنے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ خامیاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئیں۔ اس سلسلے میں بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے عروج کو سنبھال نہیں سکے جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے زوال سے سمجھوتا نہیں کر سکے۔ انہیں بہت برسوں تک یقین ہی نہیں آیا کہ وہ زوال کا شکار ہو چکے ہیں اور وہ اس حقیقت کو قبول نہیں کر پائے کہ ان کی مقبولیت کا سفر ختم ہو چکا ہے۔ کبھی انہوں نے ”امر پریم“، ”آنند“ اور ”اوتار“ جیسی فلموں میں کام کیا تھا پھر وہ وقت بھی آیا جب ڈھلتی عمر میں وہ ٹی وی پر چھوٹے موٹے کرداروں میں نظر آنے لگے یا پھر انہوں نے ”وفا“ اور ”جاناں“ جیسی مضحکہ خیز فلمیں سائن کر لیں۔

راجیش کھنہ کی زندگی کے سفر پر نظر ڈالی جائے تو وہ تضادات کا نمونہ نظر

راجیش کھنہ اور جیتندر

آتے ہیں۔ ان کے انتقال کے دو ہفتے بعد تک ان کے بارے میں جو تبصرے ذرائع ابلاغ پر ہوتے رہے، ان کے پیچھے بھی راجیش کھنہ کی شخصیت کے تضادات جھلکتے نظر آئے۔ کچھ لوگوں نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے اور کچھ لوگوں کے الفاظ کے پیچھے طنز کی کاٹ بھی محسوس ہوئی۔ کسی مقام پر راجیش کھنہ کی ذات ایک معما بھی محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں کی باتیں، حقائق، افواہیں، ان کے انٹرویوز، ان کے بارے میں چھپنے والی خبریں، ان سب کا جائزہ لیں تو راجیش کھنہ کی ایک بہت ہی الجھی ہوئی شخصیت سامنے آتی ہے جسے سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

انہوں نے حیرت انگیز کامیابیاں بھی حاصل کیں اور دل توڑ دینے والی ناکامیوں کا سامنا بھی کیا۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک بھی تھے اور ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی تھی لیکن دوسری طرف وہ شدید عدم تحفظ کا شکار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ ایسا بچہ دکھائی دیتے ہیں جو کھیلنے کے لیے چاند مانگتا ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ چاند حاصل بھی کر لے گا، دوسری طرف وہ کوئی قدم اٹھاتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔ انہوں نے زندگی میں کئی ایسے لوگوں کو اپنے سے دور کر دیا جو کبھی ان کے بے حد قریب تھے۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ وہ ہماری اور آپ کی طرح عام سے انسان تھے؟ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ سب سے الگ تھلگ، بہت مختلف اور منفرد قسم کے انسان تھے؟

ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کے لیے سیکڑوں لوگوں سے بات کی گئی۔ ان میں سے کچھ نے راجیش کھنہ کے ساتھ کام کیا تھا۔ کچھ ان کی ڈرامائی زندگی میں کسی نہ کسی انداز میں شریک رہے تھے۔ کچھ ان کے کیریئر کے دوران ان کے ہمقدم تھے اور کچھ کو راجیش کھنہ کی زندگی کے مختلف ادوار میں ان سے واسطہ پڑا تھا۔ اصل راجیش کھنہ کو تلاش کرنے کے لیے فلمی دنیا کے اس دور کو کھنگالا گیا جب فلمیں صرف پیسے کے لیے نہیں بنائی جاتی تھیں، ان کے پیچھے شوق، جذبہ اور لگن بھی ہوتی تھی۔ جب فلمی ستارے براہ راست صحافیوں اور پرستاروں سے ملتے تھے، جب پبلک ریلیشنز کمپنیاں اور ایجنٹ ان کا امیج بنانے کا کام نہیں کرتی تھیں۔

راجیش کھنہ پر زوال ضرور آیا لیکن وہ حالات سے ہار ماننے والے انسان نہیں تھے۔ ایک بار ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا ”مجھے اگر دوبارہ زندگی ملے تو میں اسے بھی اپنی موجودہ زندگی کی طرح ہی گزارنا پسند کروں گا۔ وہی کامیابیاں، وہی ناکامیاں، وہی خوشیاں، وہی دل ٹوٹنے کے صدمے جن سے مجھے موجودہ زندگی میں واسطہ پڑا، میں دوبارہ ان سے گزرنا پسند کروں گا۔ وہی خواتین جو میری موجودہ زندگی میں آئیں، میں اپنے دوسرے جنم میں بھی انہی سے ملنا چاہوں گا۔“

اس کا مطلب ہے راجیش کھنہ کو اپنی زندگی پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

(جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

ان کی پرورش کرنے والے اُن کے حقیقی والدین نہیں تھے

تمکین تبسم

قسط:2

ممبئی کے جنوب میں ایک مضافاتی علاقہ ہے جسے گڑگاؤں بھی کہا جاتا ہے اور گڑ گام بھی۔ یہ سنسکرت کے دو لفظوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے جن کا مطلب ہے ''پہاڑی گاؤں''۔ اس علاقے کے ایک محلے کا نام ''ٹھاکر دوار نا کہ'' ہے، اس محلے میں واقع ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے ایک کشادہ فلیٹ میں جتین کھنہ نامی ایک چھوٹا سا لڑکا رہتا تھا جو آگے چل کر راجیش کھنہ کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔

تقسیم ہند کے بعد 1950ء کی دہائی میں ممبئی جو اس وقت بمبئی کہلاتا تھا، بہت تیزی سے ایک بڑے معاشی مرکز میں تبدیل ہو رہا تھا اور بھارت کے تمام چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں سے لوگ تعلیم، روزگار وغیرہ کے بہتر مواقع کی تلاش میں اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر گڑگام کا رخ کرتے تھے اور اس کی آبادی میں مدغم ہو جاتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ مراٹھی بولنے والے لوگوں کا علاقہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے آباد ہو چکے تھے۔

1950ء کی دہائی میں ممبئی جہاں دوسرے شعبوں میں تیزی سے ترقی کر رہا تھا، وہیں یہ فلمی دنیا کے لیے بھی سنہرا دور تھا۔ فلم کے شعبے میں نہ صرف حکومت سرمایہ کاری کر رہی تھی بلکہ عام آدمی بھی فلم انڈسٹری میں سرمایہ لگانے کے لیے ادھر کا رخ کر رہا تھا۔ سرمایہ داروں کے لیے فلمسازی ایک منافع بخش کاروبار کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ یہ شعبہ دیگر کاروباروں کی طرح خشک اور غیر دلچسپ بھی نہیں تھا، اس میں منافع کے ساتھ ساتھ رنگینیاں اور دلچسپیاں بھی تھیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب اداکاری کے میدان میں اشوک کمار، دلیپ کمار، راج کپور، گرودت جیسے نام جگمگانے لگے تھے، جبکہ ہدایت کاری کے شعبے میں محبوب خان، بمل رائے اور بی آر چوپڑا جیسے لوگ اپنی دھاک بٹھا چکے تھے۔ اس دور میں جتین کھنہ جس فلیٹ میں پرورش پا رہا تھا اس کی بالکونی سے ''رائل اوپیرا ہاؤس'' کی عمارت نظر آتی تھی جو ایک بارونق بازار میں واقع تھا۔ اس عمارت میں اسٹیج ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے، میوزک کنسرٹس بھی ہوتے تھے، جبکہ بنیادی طور پر یہ ایک سینما ہاؤس تھا۔ کم عمر جتین کھنہ جب اس عمارت کے قریب سے گزرتا تو اس کی بیرونی دیوار پر اسے ان فلموں کے بڑے بڑے پوسٹر دکھائی دیتے جو یہاں دکھائی جا چکی تھیں یا آئندہ دکھائی جانی تھیں۔

جتین کھنہ کے والد کا نام چنی لال کھنہ اور والدہ کا نام لیلاوتی کھنہ تھا۔ ریکارڈ بتاتا ہے کہ جتین ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کی پرورش شاہانہ انداز میں ہو رہی تھی۔ چنی لال ایک خوشحال آدمی تھے۔ وہ ایک ٹھیکیدار تھے۔ ریلوے اور دیگر کئی سرکاری محکموں کو مختلف اشیاء سپلائی کرتے تھے۔ انہوں نے گھر میں ہی دفتر بنا رکھا تھا اور اپنی بالکونی کی دیوار پر اپنی کمپنی کا بورڈ بھی آویزاں کر رکھا تھا۔

جتین کھنہ اپنی والدہ لیلاوتی کو ''چاچی جی'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ چنی لال اور لیلاوتی اس کے حقیقی والدین نہیں تھے، وہ اس کے چچا اور چچی ہی تھے۔ وہ بے اولاد تھے اور انہوں نے جتین کو گود لیا تھا۔ وہ پہلے امرتسر میں رہتے تھے، تقسیم ہند کے بعد وہ ممبئی آ گئے تھے۔ جتین کی پیدائش امرتسر کی تھی۔ جتین عرف راجیش کھنہ نے کبھی اپنے کسی انٹرویو میں ان باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ شاید وہ اس حقیقت کو سامنے لانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بعد میں زندگی کے مختلف ادوار میں ان کے جو رویے رہے، ان میں شاید اس حقیقت کا بھی کچھ نہ کچھ عمل دخل رہا ہے۔ ان کے لاشعور کے کسی تاریک گوشے میں شاید احساس جاگزیں رہا ہو اور عین ممکن ہے انہیں کچوکے بھی لگاتا رہا ہو کہ ان کے حقیقی والدین نے کمسنی میں انہیں خود سے دور کر دیا تھا، کسی اور کے سپرد کر دیا تھا۔

1940ء کی دہائی کے اواخر میں جتین کو گڑگام میں ایک نہایت معیاری اسکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں خوشحال طبقے کے بچے پڑھتے تھے۔ اس کا نام ''سینٹ سباسچین گوان ہائی اسکول'' تھا۔ اس اسکول میں روی کپور نام کا ایک بچہ جتین کا دوست بنا جس نے آگے چل کر جیتندر کے نام سے ایک فلمی ہیرو کے طور پر شہرت پائی۔

انیل بابورائے نامی ایک صاحب جو اس زمانے میں اس اسکول کے قریب رہتے تھے، یادوں کے پرانے خزانے کو کھنگالتے ہوئے بتاتے ہیں ''دونوں بچے اپنی اپنی کار میں اسکول آتے تھے، چھٹی کے وقت دونوں دوڑتے ہوئے اسکول سے نکلتے تھے اور سڑک کے دوسری طرف موجود ٹھیلے والوں سے کبھی آئسکریم، کبھی چاکلیٹ اور کبھی گولا گنڈا خریدتے تھے۔''

جتین کی عرفیت اس زمانے میں ''کاکا'' تھی اور انہیں زیادہ تر اسی نام سے پکارا جاتا تھا، ان کے ہیرو بن جانے کے بعد فلمی دنیا میں بھی یہ عرفیت مشہور رہی۔ ان کے والدین خواہ حقیقی نہیں تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ حقیقی والدین سے بھی بڑھ کر ان سے پیار کرتے تھے۔ جتین ان کی آنکھوں کا تارا تھے، ان کی ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی۔ ذرا سی بات ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو وہ منہ بسورنے لگتے اور ان کے منہ بولے والدین انہیں منانے اور خوش کرنے کے لیے ہر جتن کرنے لگتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک لاڈلے شہزادے کی طرح پرورش پا رہے تھے۔ شاید اسی لاڈ پیار اور بے جا ناز برداری نے آگے چل کر انہیں ضدی اور خودسر بنا دیا۔

جتین جب دس سال کے ہوئے اس وقت تک چنی لال مزید ترقی کر چکے تھے۔ انہوں نے گھر کے قریب ایک الگ آفس بنا لیا تھا جہاں کئی لوگ کام کرتے تھے۔ چنی لال نے ٹھیکیداری کے علاوہ اپنا کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک روز جتین ان کے آفس گئے تو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھے، کسی میٹنگ میں تھے۔ جتین ان کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئے جو انہیں بہت آرام دہ لگی۔ وہ اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر ایک کامک بک پڑھنے لگے، اس دوران ان کے ماموں کمرے میں آ گئے، وہ بھی چنی لال کے آفس میں ملازم تھے۔

انہوں نے جتین کو ''باس'' کی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو ذرا غصے سے بولے ''کاکا! تم صاحب کی کرسی پر کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ پہلے اپنے آپ کو اس قابل بناؤ پھر اس کرسی پر بیٹھنا۔''

جتین سے کبھی کسی نے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی، ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ خاموشی سے اٹھے اور گھر آ گئے، ماموں کی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی منہ بولی والدہ کو ساری بات بتا کر گلوگیر آواز میں پوچھا ''ماموں نے ایسا کیوں کہا؟ ان کی بات کا مطلب کیا تھا؟''

لیلاوتی نے پہلے انہیں خوب پیار کیا پھر سمجھانے لگیں ''بیٹا! شاید ان کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے تم خوب محنت کرو پڑھو لکھو، بڑے آدمی بنو پھر اس کرسی پر بیٹھنا۔''

پھر وہ جتین کو بتانے لگیں ''بیٹا! تمہارے چاچا جی کسی زمانے میں ایک غریب سے آدمی تھے، ہم ایک بلڈنگ کے کوٹھری جیسے کمرے میں رہتے تھے لیکن تمہارے چاچا جی نے بہت محنت کی، دن رات کام کیا، تب جا کر بھگوان نے انہیں یہ دن دکھائے کہ ان کا اپنا اتنا بڑا دفتر ہے، کاروبار ہے۔ تم بھی لکھ پڑھ کر خوب محنت کرنا، پھر ایک دن تم بھی اس کرسی پر بیٹھنے کے قابل ہو جاؤ گے۔''

تب سے یہ بات جتین عرف کاکا کے ذہن میں بیٹھ گئی کہ باس بن کر کرسی پر بیٹھنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ فلم انڈسٹری میں بڑا مقام اور شہرت حاصل کرنے کے بعد راجیش کھنہ نے کئی بار دوستوں اور احباب کے سامنے اور اپنے بعض انٹرویوز میں بھی اس واقعے کا ذکر کیا۔ یہ بات بچپن سے ہی ان کے تحت الشعور میں جاگزیں رہی کہ انہیں بڑا آدمی بننا ہے۔

پہلا عشق جتین کو بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہوا۔ اس عمر میں وہ خاصے ہینڈسم دکھائی دینے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے اپنے والدین کے سامنے ضد کر کے ایک بہت خوبصورت اور مہنگی سائیکل خریدی تھی۔ ایک روز وہ اسے اپنی بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں بڑے جوش و خروش اور تیز رفتاری سے چلا رہے تھے۔ اپنی من پسند سائیکل کی سواری میں انہیں بڑا لطف آ رہا تھا، اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ وہ دھڑام سے سائیکل سمیت گر پڑے۔ بڑی مشکل سے اٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا ایک گھٹنا بری طرح چھل چکا ہے اور اس سے خون نکلنے لگا ہے، اس وقت وہ نیکر پہنے ہوئے تھے۔

اپنا زخمی گھٹنا دیکھ کر وہ بے اختیار رونے لگے، چند لمحے بعد انہوں نے دیکھا کہ ایک

(اوپر) وہ عمارت، جس میں راجیش کھنہ کا بچپن گزرا (نیچے) شرمیلا ٹیگور کے ساتھ

لڑکی بھاگتی ہوئی بلڈنگ سے نکل کر ان کی طرف آئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک اینٹی سیپٹک دوا کی شیشی اور پرانی ساڑھی تھی۔ جتین نے پہچان لیا، وہ اسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہنے والی لڑکی تھی، اس کا نام سریکھا تھا اور وہ جتین سے تین چار سال بڑی تھی۔ کبھی کبھار ان کا سامنا ہوتا تو وہ میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ جتین کی طرف دیکھتی تھی۔ جتین نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً رونا بند کر دیا، انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ایک لڑکا کسی لڑکی کے سامنے روتا ہوا تو بالکل اچھا نہیں لگے گا۔

سریکھا نے بہت پیار اور اپنائیت سے جتین کا زخم صاف کیا، اس پر دوا لگائی اور پرانی ساڑھی کو پھاڑ کر ایک پٹی بنا کر اس پر لپیٹ دی۔ اس دوران وہ محبت بھرے انداز میں انہیں حوصلہ بھی دیتی رہی۔ ان کے چہرے کئی بار ایک دوسرے سے مس ہوئے اور ہر بار جتین کے وجود میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ان کے خون کی گردش اتنی تیز ہوئی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ سریکھا کے گرم سانسوں کی تپش انہیں اپنے رخساروں پر محسوس ہو رہی تھی اور ان کا وجود گویا پگھل رہا تھا۔

اچھی طرح پٹی باندھنے کے بعد سریکھا نے مسکراتے ہوئے جتین کو دیکھا۔ اس لمحے جتین کے معصوم دل میں پہلے عشق کی کلی کھلی۔ اس رات جتین چھت پر جا کر ساکت بیٹھے بہت دیر تک چاند کو تکتے رہے اور چاند میں انہیں سریکھا کا چہرہ دکھائی دیتا رہا۔ اس دن کے بعد وہ کھوئے کھوئے رہنے لگے، سریکھا سے ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اسکول سے واپسی پر جتین تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتے کانپتے سب سے پہلے سریکھا کے فلیٹ پر جاتے اور اسے بتاتے کہ اسکول میں ان کا وقت کیسا گزرا، وہاں کیا کچھ ہوا، کس نے کیا کہا۔

دو تین مرتبہ وہ دونوں ایک ساتھ فلم دیکھنے بھی گئے۔ سینما ہال کی تاریکی میں سریکھا، جتین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہتی اور جتین کے جسم میں بجلیاں دوڑتی رہتیں۔ کبھی سریکھا، جتین کا ہاتھ خود اپنے جسم پر رکھ لیتی۔ یہ لمحے گویا جتین کے لیے بڑے سخت امتحان کے ہوتے۔ جتین کے خوابوں پر بھی گویا سریکھا کا راج ہو گیا، وہ دن رات اسی کے بارے میں سوچتے، اسی کے تصور میں کھوئے رہتے۔ ان کے عشق میں وہی شدت تھی جو لڑکپن کے معصوم عشق میں ہوتی ہے۔ راجیش کھنہ نے 1975ء میں ایک خاتون فلمی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس عشق کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ آج تک سریکھا کو نہیں بھول سکے اور آج بھی وہ اس کے بارے میں سوچتے ہیں، اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کا تصور کرتے ہیں تو ان کے وجود میں وہی حرارت، وہی بجلیاں دوڑ جاتی ہیں جو لڑکپن کے اس عشق کے زمانے میں دوڑتی تھیں۔

آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ اس عشق کا انجام کیا ہوا؟

وہی جو عموماً بچپن اور لڑکپن کے عشق کا ہوتا ہے...... یعنی ناکامی کا صدمہ...... جدائی کا داغ۔ ہوا یوں کہ ایک روز جتین اسکول بیگ کمر پر لادے، سیڑھیاں پھلانگتے، ہانپتے کانپتے سریکھا کے فلیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ دروازے پر بڑا سا تالا لٹکا ہوا ہے۔ جتین کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اِدھر اُدھر سے معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ سریکھا اٹھارہ سال کی ہو گئی تھی اور اس کے گھر والے اس کی شادی کرنے کے لیے اسے ساتھ لے کر اپنے آبائی گاؤں چلے گئے تھے۔

(جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

لڑکپن کا پہلا اور معصوم عشق

اُن کے لیے ناقابلِ فراموش تھا

تمکین تبسم

قسط:3

سریکھا کیا گئی، نوعمر جتین کی زندگی سے گویا سب کچھ ہی چلا گیا۔ اس کا معصوم دل ایک ایسے غم میں ڈوب گیا جس کا کوئی علاج اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ خاموش اور اُداس رہنے لگا۔ اسے اپنے اردگرد کوئی ایسی شخصیت دکھائی بھی نہیں دیتی تھی جس کے سامنے وہ اپنا یہ دُکھ بیان کرسکتا۔

برسوں بعد جب جتین، راجیش کھنہ بن گئے اور بولی وڈ میں ان کا طوطی بول رہا تھا، تب بھی انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں سریکھا کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ان کی زندگی میں سریکھا کے بعد بہت سی لڑکیاں آئیں لیکن وہ سریکھا کو کبھی نہیں بھلا سکے۔ لڑکپن کا پہلا اور معصوم عشق ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کچھ بھی بن جائے، ترقی کی کوئی سی بھی منزلیں طے کرلے لیکن اس عشق کے نقوش اس کے دل سے کبھی نہیں مٹتے۔

جتین کو جب سریکھا کی یاد زیادہ ستاتی اور دل کچھ زیادہ ہی بوجھل ہوتا تو وہ اپنی بلڈنگ کی چھت پر چلے جاتے اور کھوئی کھوئی نظروں سے دیر تک ممبئی کی عمارتوں کو تکتے رہتے جو تاحد نظر پھیلی دکھائی دیتی تھیں۔ اس دوران کبھی کسی طیارے کی آواز سنائی دے جاتی تو وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگتے اور اس وقت تک دیکھتے رہتے جب تک وہ اُفق پر نظروں سے اوجھل نہ ہوجاتا۔ ایک بار تو یونہی جہازوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کیا کہ بڑے ہوکر وہ پائلٹ بنیں گے اور اسی طرح جہاز لے کر بیکراں فضاؤں میں اُڑتے پھریں گے۔ اس وقت بھی ان کے دل میں اصل خیال یہی تھا کہ شاید اس طرح انہیں اپنے ناکام عشق کا صدمہ بھلانے میں مدد ملے۔

اسی زمانے میں تھیٹر سے ان کی محبت کی بنیاد پڑی۔ ایک بار ان کی والدہ ایک اسٹیج ڈرامہ دیکھنے گئیں تو انہیں بھی ساتھ لے گئیں۔ نوعمر جتین کے لیے یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ انہوں نے کئی اداکاروں کو مختلف بہروپ دھارے اپنے اپنے کردار ادا کرتے دیکھا تو انہیں یہ کام بہت دلچسپ محسوس ہوا۔ دوسرے روز انہوں نے بلڈنگ کے ان سب لڑکوں کو جمع کیا جو ان کے ہم عمر اور دوست تھے۔ وہ انہیں بلڈنگ کی چھت پر لے گئے۔ انہوں نے جو ڈراما، تھیٹر ہاؤس میں اپنی والدہ کے ساتھ دیکھا تھا، اسی کے کرداروں میں سے ایک ایک کردار انہوں نے اپنے سب دوستوں کو دے دیا اور ایک کردار خود اپنے لیے بھی منتخب کرلیا۔ یوں انہوں نے گویا اس ڈرامے کو اپنی بلڈنگ کی چھت پر ری پروڈیوس کیا جو وہ اپنی والدہ کے ساتھ دیکھ کر آئے تھے۔ ڈرامے کا یہ "ری میک" خواہ بچکانہ تھا اور اسے دیکھنے کے لیے کوئی تماشائی یا ناظر موجود نہیں تھا، اس کے باوجود ان سب کو اس کام میں بہت مزا آیا۔ جتین سمیت سب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک عمدہ تفریح تھی۔

چند دن بعد انہوں نے اپنے ڈراموں کے لیے کاسٹیوم اور میک اَپ وغیرہ کا بھی حسب توفیق بندوبست کرنا شروع کردیا جس کے بعد ان کا مشغلہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہوگیا۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے راجیش کھنہ نے بعد میں ایک بار بتایا۔ "مجھے سب سے زیادہ مزا خانہ بدوش کا کردار کرنے میں آتا تھا۔ میں پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اور اپنا حلیہ بگاڑ کر جب یہ کردار ادا کرتا تو سچ مچ اپنے آپ کو خانہ بدوش محسوس کرتا۔ مجھے تھیٹر دیکھنے سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ میں اسٹیج ڈراما دیکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ ڈرامے کے اختتام پر سب اداکار ایک گروپ کی شکل میں اسٹیج پر حاضرین کے سامنے آتے اور انہیں خوب داد ملتی۔ میرے لئے یہ منظر بڑا پُرکشش ہوتا۔ مجھے ان اداکاروں پر رشک آتا جن کے لیے اتنی تالیاں بجتی تھیں۔ اس کم عمری میں میرے دل پر، عشق کی ناکامی نے جو زخم لگایا تھا، اس پر اس مشغلے نے گویا تھوڑا سا مرہم رکھ دیا۔"

جتین ذرا بڑے ہوئے تو ان کا رجحان فلموں کی طرف ہوگیا۔ وہ قریبی سنیما میں لگنے والی ہر نئی فلم دیکھنے جانے لگے۔ 1950ء کی دہائی جب اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی تو ممبئی میں بہت سی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ 1958ء ختم ہوا تو جتین سولہ سال کے ہوچکے تھے۔ انہیں پڑھنے کے لیے پونا بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے واڈیا کالج میں داخلہ لیا۔ انہوں نے رمیش باٹلیکر کے گھر میں قیام کیا جو گرگام میں ان کے پڑوسی رہے تھے۔

2012ء میں رمیش باٹلیکر نے ایک انٹرویو میں بتایا۔ "جتین اس عمر میں ہی بہت وجیہ تھا اور وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ اسے اداکار بننا ہے۔ ایک بار اس نے مجھے اپنی ایک تصویر دکھائی اور خوشی بھرے لہجے میں بتایا کہ اس نے یہ تصویر راج کپور کو بھیجی ہے اور ساتھ ہی ایک خط لکھا ہے جس میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ ان کی فلموں میں اداکاری کرنا چاہتا ہے۔"

جہاں تک پڑھائی کا تعلق تھا، جتین ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ دوسری تمام چیزوں کے مقابلے میں اسے تھیٹر اور فلم سے زیادہ محبت تھی۔ پونا میں وہ دو سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزار سکے۔ انہیں ممبئی کی یاد بہت ستاتی تھی۔ آخرکار 1961ء میں وہ ممبئی لوٹ آئے۔ بی۔ اے کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کے۔ سی کالج میں داخلہ لینا پڑا تاہم اب وہ خوش تھے کہ گھر لوٹ آئے تھے اور ممبئی کی فضاؤں میں سانس لے سکتے تھے۔ یہاں وہ ایک آزاد پنچھی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ کالج کے بعد ان کا زیادہ وقت سنیما اور تھیٹر میں گزرتا تھا۔ کبھی وہ ساحل سمندر پر چلے جاتے۔ مستقبل کے بارے میں ان کے اور والد کے درمیان ایک اختلاف موجود تھا۔ وہ بدستور ایکٹر بننے کے خواب دیکھ رہے تھے جبکہ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کا کاروبار سنبھال لیں۔

جتین کو معلوم تھا کہ چنی لال کیا چاہتے ہیں۔ جتین کی خواہش تھی کہ ان کی اس معاملے میں اپنے والد سے صاف طور پر ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ انہوں نے اس موضوع پر کوئی فیصلہ کن گفتگو ہونے کا موقع آنے سے پہلے ہی ایک ڈراما کمپنی میں ریہرسلز دیکھنے کے لیے جانا شروع کردیا۔ اس کمپنی میں جتین کے ایک دوست کام کرتے تھے اور وی۔ کے شرما نامی ایک صاحب یہاں ڈراما ڈائریکٹر تھے۔

فلم ڈائریکٹر اور مصنف ساگر سرحدی جنہوں نے بعد میں "کبھی کبھی" اور "سلسلہ" جیسی یادگار فلمیں لکھیں، وہ اس زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔ "وہ ڈرامے کے فن سے محبت کرنے والے لوگوں کا ایک گروپ تھا جس میں شامل لوگ بڑی لگن سے اپنا اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ ان کا ڈائریکٹر وی۔ کے شرما میرا دوست تھا۔ اس کا تعلق یوپی سے تھا۔ چھوٹے سے قد کا آدمی تھا لیکن بے حد باصلاحیت تھا۔ وہ ڈرامے لکھتا تھا، ڈائریکٹ کرتا تھا اور ان میں اداکاری بھی کرتا تھا۔ جتین نے اسے اپنا "گرو" بنالیا تھا لیکن اس کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اداکار بننا چاہتے ہیں، وہ بس وہاں آکر خاموشی سے ایک کونے میں کھڑے رہتے اور ریہرسلز دیکھتے رہتے۔ شاید انہیں امید تھی کہ کسی روز شرما کی نظر ان کے اندر چھپے ہوئے فنکار تک پہنچ جائے گی۔"

آخر ایک روز نوجوان جتین کی یہ امید بر آئی۔ ہوا یوں کہ جس ڈرامے کی ریہرسل چل رہی تھی، اس کا ایک اداکار بیمار ہوگیا۔ اس کا رول بہت اہم یا بڑا تو نہیں تھا لیکن ڈرامے میں اس کی موجودگی بہرحال ضروری تھی اور دو دن بعد ڈراما شروع ہورہا تھا۔ وی۔ کے شرما کافی پریشان تھا اور اس پریشانی کے دوران اس کی نظر جتین پر پڑی تو اس نے گویا ایک نئے زاویہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھ لیا۔ "کیا تم یہ رول کرسکتے ہو؟"

جتین نے متانت سے اثبات میں سر ہلا دیا اور یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ یہ سن کر ان کے دل کی دھڑکن بے پناہ تیز ہوگئی تھی۔ اس ڈرامے کا نام "میرے دیش کے گاؤں" تھا اور یہ ناگپور میں پیش کیا جانا تھا۔ دراصل وہاں صوبائی سطح پر، سرکاری سرپرستی میں ڈراموں کا ایک مقابلہ ہورہا تھا۔ یہ ڈرامہ اس مقابلے میں شریک تھا۔ جتین کے ایک دوست ہری دت اس ڈرامے میں ہیرو تھے۔

وہ اس زمانے کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔ "یہ ڈرامہ 3 مئی 1961ء کو پیش کیا گیا۔ مجھے یہ تاریخ اس لیے یاد ہے کہ مجھے اس میں مرکزی کردار ادا کرنے پر بہترین اداکار کا ایوارڈ ملا تھا اور وہ کردار ذہنی طور پر پسماندہ نوجوان کا تھا۔ جتین نے اس میں ایک معمولی سا رول کیا تھا۔ وہ محض ایک دربان تھے لیکن مجھے یاد ہے کہ اسٹیج پر یہ رول کرتے وقت بھی ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں کیونکہ اتنے زیادہ حاضرین کے سامنے اسٹیج پر آنے کا یہ ان کے لیے پہلا موقع تھا۔ پورے ڈرامے میں ان کا صرف ایک مکالمہ تھا۔ "جی حضور! صاحب گھر میں ہیں۔" یہ مکالمہ بولنے کے لیے جتین نے بیسیوں مرتبہ ریہرسل کی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں اداکار بننے کی زبردست لگن اور خواہش موجود تھی۔ تاہم جب ان کا اسٹیج پر آنے اور اپنا مکالمہ بولنے کا موقع آیا تو گھبراہٹ کے مارے وہ یہ چند
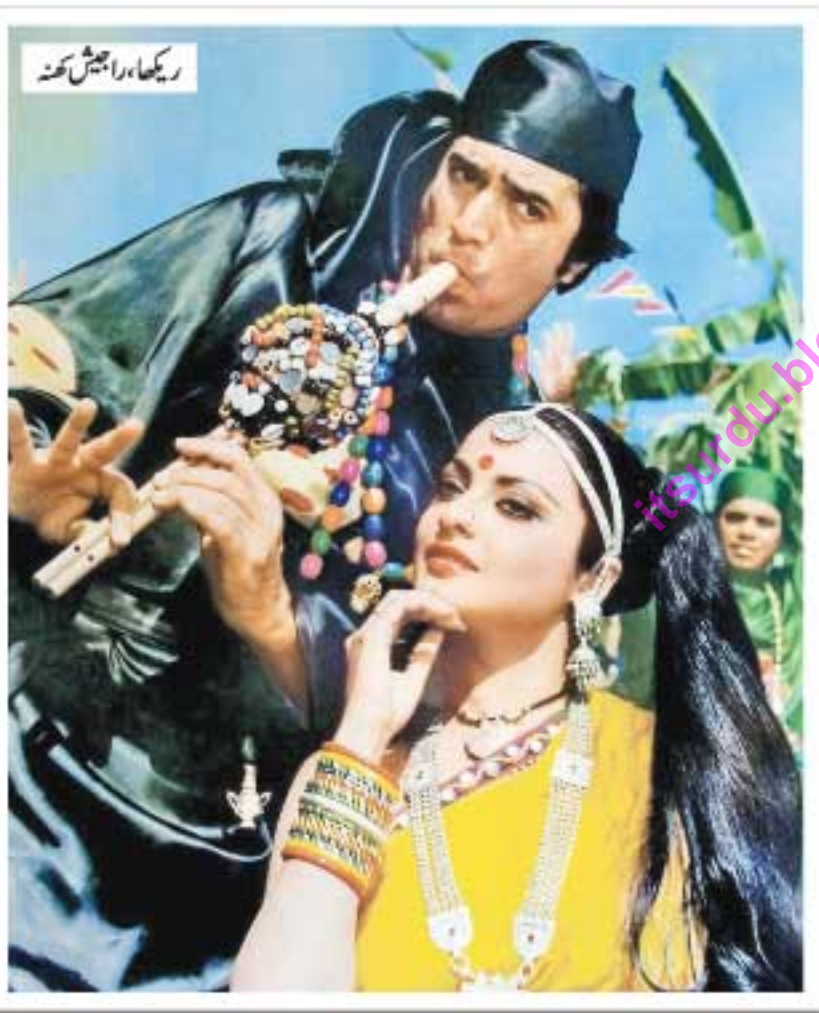
ریکھا، راجیش کھنہ

الفاظ ادا کرنے میں بھی گڑبڑا گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ کہتے "جی حضور! صاحب گھر میں ہیں" انہوں نے کہہ دیا۔ "جی صاحب! حضور گھر میں ہیں۔" حاضرین نے تو شاید اس غلطی کو محسوس نہیں کیا لیکن ڈائریکٹر کا غصے سے برا حال تھا۔"

برسوں بعد ایک انٹرویو میں راجیش کھنہ نے خود بھی اس واقعے کا ذکر کیا اور بتایا۔ "اتنی ریہرسل کے بعد بھی مکالمہ غلط بولنے پر میں اتنا شرمندہ تھا کہ اپنا کردار ادا کرتے ہی، کسی سے ملے بغیر اور کسی سے آنکھ ملائے بغیر گھر آگیا۔ میں اپنے آپ سے بھی شرمندہ تھا۔ اپنے کمرے میں بستر پر گر کر میں دیر تک روتا رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ ایکٹر بننے کے سلسلے میں مجھ میں جتنی بھی خوداعتمادی موجود تھی، وہ مٹی میں مل گئی تھی۔"

انہیں لگا کہ وہ کبھی اداکار نہیں بن سکتے۔ ادھر والد صاحب کا اصرار تھا کہ وہ ان کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹائیں لیکن کاروبار کی طرف جانے کے لیے تو ان کا دل ہی نہیں مانتا تھا جبکہ اداکاری کے بارے میں بھی وہ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ اگر وہ ایک چھوٹا سا مکالمہ بھی ٹھیک نہیں بول سکتے تو اور بھلا کیا کرسکتے ہیں؟

ان کی پریشانی اور شرمندگی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کئی پیگ وسکی کے بھی حلق سے اتار لیے لیکن نہ تو دل کی خلش کم ہوئی اور نہ ہی نیند آئی۔ ان کا اس ڈرامے کے اگلے شوز میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن دوسرے روز دوستوں نے انہیں سمجھایا کہ اس طرح تو ہوجاتا ہے، ایسی باتوں کی وجہ سے انسان کو اپنے خوابوں سے دست بردار نہیں ہوجانا چاہیے۔ دوستوں کے سمجھانے بجھانے پر وہ ڈرامے میں دوبارہ شامل ہوئے۔ وہ ایک کامیاب ڈرامہ ثابت ہوا اور کافی دنوں تک چلا۔

ساگر سرحدی بتاتے ہیں۔ "میں نے ان دنوں جو ڈرامے لکھے، ان میں سے صرف دو ڈراموں میں جتین نے کام کیا تھا۔ ایک تو یہی، جس کا ذکر ہوچکا ہے یعنی "میرے دیش کے گاؤں۔" دوسرا تھا "اور شام گزر گئی" ہم ان دنوں جتین کو ایک خوش شکل اور خوش مزاج نوجوان کے طور پر جانتے تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم اسے ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ہی ہم نے کبھی سوچا تھا کہ آگے چل کر وہ اتنا مقبول اور نامور اداکار بنے گا۔"

جتین کے لیے یہی غنیمت تھا کہ انہیں تھیٹر چھوڑنا نہیں پڑا تھا۔ وہ روزانہ باقاعدگی سے ان لوگوں کی محفلوں میں بیٹھتے جن کا تھیٹر سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ چائے کے دور چلتے، سگریٹوں کا دھواں کمرے میں چکراتا، جوش و خروش سے نئے نئے آئیڈیاز پر بات ہوتی۔ وہاں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جن کا اوڑھنا بچھونا تھیٹر تھا۔ جتین کو ان لوگوں میں بیٹھنے اور ان کی گفتگو میں حصہ لینے میں بہت مزا آتا تھا۔ انہوں نے کالجوں کے درمیان منعقد ہونے والے ڈراموں کے مقابلوں میں بھی حصہ لینا شروع کردیا تھا لیکن وہاں بھی انہیں چھوٹے موٹے رول ہی ملتے تھے۔

(جاری ہے)

گیتا بالی

قسمت نے انہیں گیتا بالی سے ٹکرا دیا

قسط:4

کالج کے ڈراموں میں پہلی بار راجیش کھنہ کو ''اور دیے بجھ گئے'' میں نمایاں رول ملا، یہ ڈراما ساگر سرحدی کا لکھا ہوا تھا۔ اس ڈرامے میں نہ صرف راجیش کھنہ کا رول اہم تھا بلکہ انہیں کالج کے ڈراما فیسٹیول میں اس رول پر ایوارڈ بھی ملا۔ راجیش کھنہ جو اس وقت تک جتن ہی کہلاتے تھے، اپنی اس پہلی کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس زمانے کے لوگ بتاتے ہیں کہ نوجوانی کے اس دور میں بھی دو چیزیں راجیش کھنہ کی شخصیت کو نہایت پرکشش بناتی تھیں۔ ایک تو اس کی مسکراہٹ، دوسری اس کے چہرے کی معصومیت...... اس کی وجاہت کے ساتھ ساتھ اس کی ان دو خصوصیات کی وجہ سے کالج کی وہ لڑکیاں بھی اس سے رسم وراہ بڑھانے میں خود پہل کرتی تھیں جو کسی دوسرے کو گھاس نہیں ڈالتی تھیں۔

فریدہ جلال، راجیش کھنہ

راجیش، ہیما مالنی

اسٹیج ڈراموں میں کامیابی کے بعد ظاہر ہے راجیش کھنہ کی اگلی منزل فلمی دنیا تھی، ان کی شخصیت میں اب خود اعتمادی آچکی تھی۔ انہوں نے اپنی تصویریں ساتھ لے کر مختلف فلم پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کے دفتروں کے چکر لگانے شروع کردیے۔ اسی دوران ایک روز راجیش کھنہ کو بی۔ ایس تھاپا کا فون آیا، اسٹیج ڈراموں کے ڈائریکٹرز میں ان کا بہت بڑا نام تھا، انہوں نے راجیش کو بتایا کہ وہ اپنے آئندہ ڈرامے میں انہیں ہیرو لینا چاہتے ہیں۔ راجیش کھنہ کے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی، طے پایا کہ دوسرے روز ''گیلارڈ ریسٹورنٹ'' میں وہ دونوں ملاقات کریں گے اور اس سلسلے میں تفصیلی بات چیت کریں گے۔ ''گیلارڈ'' چرچ گیٹ کے قریب واقع ایک معیاری ریسٹورنٹ تھا جہاں شوبز کے بہت سے لوگوں کی نشست وبرخاست رہتی تھی۔

راجیش کھنہ کے لئے وہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی، وہ پہلے بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ دوسرے روز وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے، وہ ابھی ریسٹورنٹ سے باہر ہی تھے کہ انہوں نے ایک خوبصورت اور دلکش خاتون کو اندر جاتے دیکھا۔ خاتون کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ چند لمحوں کے لئے راجیش کھنہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ چند لمحے بعد وہ اندر پہنچے تو یہ دیکھ کر انہیں خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا کہ وہی خاتون بی۔ ایس تھاپا کی میز پر موجود تھی۔

راجیش اور تھاپا کے درمیان مصافحہ اور رسمی جملوں کا تبادلہ ہو چکا تو دلکش خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تھاپا نے راجیش سے کہا ''ان سے ملو...... یہ ہیں تمہارے آئندہ ڈرامے کی ہیروئن انجو مہندرو۔''

راجیش نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے خاتون سے بھی مصافحہ کیا، تینوں بیٹھ گئے اور پھر ڈرامے کے بارے میں بات چیت شروع ہوگئی۔ راجیش کو ہیرو سائن کرلیا گیا، انجو مہندرو ان کے مقابل ہیروئن تھیں، دوسرے روز سے ڈرامے کی ریہرسلز شروع ہوگئیں۔

انجو اور راجیش کے خاندانی پس منظر میں خاصا فرق تھا۔ انجو خالص ممبئی کی تھیں جبکہ راجیش کا تعلق ایک پنجابی گھرانے سے تھا، انجو کا گھرانہ ماڈرن اور خوشحال تھا، وہ ماڈلنگ کر چکی تھیں اور اب فلم میں کام کرنے کے لئے پر تول رہی تھیں۔ فلمی دنیا سے ان کا کچھ نہ کچھ تعلق بھی بنتا تھا۔ ان کے نانا رائے بہادر چنی لال ممبئی کے معروف فلم اسٹوڈیو ''فلمستان'' میں حصے دار تھے۔ مشہور میوزک ڈائریکٹر مدن موہن ان کے ماموں تھے۔ انجو فلمی دنیا کے ماحول اور طور طریقوں سے واقف تھیں، جبکہ راجیش کھنہ کے لئے وہ ان دیکھا، انجانا جہان تھا۔

یوں انہیں گویا باتیں کرنے کے لئے ایک بہترین موضوع میسر آگیا۔ ان کے درمیان طویل نشستیں ہونے لگیں۔ اپنے خوابوں، خواہشوں اور ارادوں کی باتیں ہوتیں، دوستی پروان چڑھنے لگی۔ راجیش کے لئے انجو کی رفاقت دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی۔ ڈرامے کی ریہرسلز پانکر ہال میں ہوتی تھیں یا پھر بھولا بھائی میموریل بلڈنگ میں۔ اس بلڈنگ میں گیتا بالی کا آفس تھا جو 1950ء کی دہائی کی نہایت مشہور اور کامیاب اداکارہ تھیں۔ وہ اپنے دور کے تمام بڑے اور مشہور ہیروز کے ساتھ کام کر چکی تھیں اور اب وہ فلمیں بھی پروڈیوس کر رہی تھیں۔ انہوں نے فلمی دنیا میں اپنا کیریئر بارہ سال کی عمر میں شروع کیا۔

ان کے آفس میں دن بھر فلم انڈسٹری کے ہر شعبے کی مشہور شخصیات کی آمدورفت جاری رہتی۔ کبھی کبھی اسی آفس کے دروازے پر اداکار بننے کے امیدواروں کی قطار بھی نظر آتی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان میں سے کسی کو گیتا بالی سے ملاقات کا موقع ملتا تھا یا نہیں اور کوئی فلم میں قسمت آزمائی کرنے کے مرحلے تک پہنچ پاتا تھا یا نہیں؟ کئی بار راجیش نے بھی سوچا کہ وہ اس قطار میں کھڑے ہوجائیں لیکن نہ جانے کیوں اپنے اس ارادے پر عمل نہیں کر سکے۔

پھر ایک روز قسمت نے ہی انہیں گیتا بالی سے ٹکرا دیا۔ وہ محاورتاً نہیں سچ مچ اس وقت گیتا بالی سے ٹکرا گئے جب وہ اپنے آفس کے دروازے سے نکل رہی تھیں اور راجیش کھنہ وہاں سے گزر رہے تھے۔ راجیش کھنہ، گیتا بالی کو اچانک دیکھ کر ایسے بدحواس ہوئے کہ ان کے منہ سے معذرت کے لئے بھی ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

گیتا بالی نے بغور ان کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر خود ہی پوچھ لیا۔ ''کیا آپ اداکار بننا چاہتے ہیں؟''

راجیش کے حلق سے اب بھی کوئی آواز نہ نکل سکی، ان کا گلا خشک ہو چکا تھا۔ انہوں نے بس مبہم سے انداز میں سر ہلا دیا، انہیں یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا یا نفی میں؟

گیتا بالی نے شاید ان کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم آج کل اپنی آنے والی پنجابی فلم کے لئے ایک نئے چہرے کی تلاش میں ہیں۔ آپ کل اپنی چند تصویریں اور فون نمبر وغیرہ یہاں آفس میں دے جایئے گا، ہم آپ سے رابطہ کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔

راجیش کا دل بلیوں اچھل رہا تھا، اس روز ان کے لئے ڈرامے کی ریہرسل کرنا بھی مشکل ہوگیا، ان کا تصور انہیں بار بار کہیں اور لے جا رہا تھا۔ وہ کچھ ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے وہ بہت بڑے فلمی ہیرو بن چکے ہیں۔

راجیش کھنہ نے گیتا بالی کی ہدایت پر عمل کیا، انہوں نے اپنی کئی تصویریں، تعارف، ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ دوسرے ہی دن گیتا بالی کے آفس پہنچا دیا، اس کے بعد تکلیف دہ انتظار کا مرحلہ شروع ہوگیا۔ دن پر دن گزرتے گئے لیکن راجیش کو جس بلاوے کا انتظار تھا وہ نہ آیا۔ حتیٰ کہ تین ماہ گزر گئے، پھر ایک روز راجیش نے اخبار

آشا پاریکھ کے ساتھ

میں پڑھا کہ گیتا بالی نے اپنی پنجابی فلم شروع کرنے کا باضابطہ اعلان کردیا تھا لیکن اس کاسٹ میں جتن کھنہ کا نام کہیں نہیں تھا، راجیش کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔

مزید ستم یہ ہوا کہ دوسرے روز انہیں گیتا بالی کے دفتر سے فون آیا، انہیں فلم کی لانچنگ پارٹی میں شریک ہونے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ فون پر انہیں یہ ''خوشخبری'' بھی سنائی گئی کہ انہیں فلم کے ہیرو سے بھی ملوایا جائے گا، اس ہیرو کا تعلق بھی پنجاب سے تھا اور اس کا نام تھا دھرمیندر۔
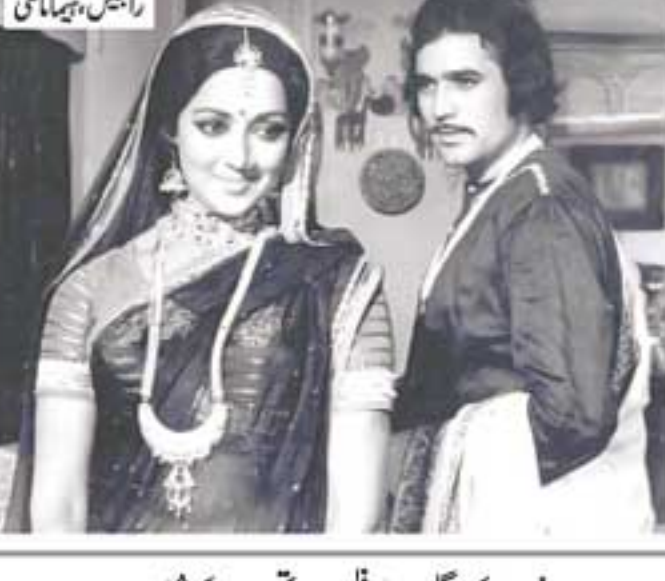
پارٹی گیتا بالی کے گھر پر رکھی گئی تھی، جس کا نام ''بلیو ہیون'' تھا۔ فلم انڈسٹری کے بہت سے جانے پہچانے چہرے پارٹی میں پہنچے ہوئے تھے۔ گھر کے طویل وعریض لان پر مدھم موسیقی کی لہریں بکھر رہی تھیں۔ مجموعی طور پر ماحول پر ایک نظر ڈال کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کوئی خوشی منائی جا رہی تھی۔ گیتا بالی نے ایک کونے میں ایک الگ تھلگ نشست پر خاموش بیٹھے جتن کو دیکھا لیکن وہ ان کی طرف نہیں آئیں، شاید انہوں نے جتن کو پہچانا نہیں تھا۔ جتن گو کہ پروقار انداز میں وہاں بیٹھے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں وہاں مدعو کیوں کیا گیا تھا؟ انہیں وہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔

آخرکار انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں وہاں سے چلے جانا چاہیے۔ پارٹی ابھی جاری تھی لیکن وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، اسی لمحے انہوں نے گیتا بالی کو اپنی طرف آتے دیکھا، ان کے خوبصورت بال ان کے کندھوں پر لہرا رہے تھے اور ایک لٹ پیشانی پر جھکی ہوئی تھی۔ انہوں نے قریب آکر جتن کو مخاطب کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ گیتا انہیں بھولی نہیں تھیں۔ اب تک جتن کو پارٹی میں اپنے اکیلے پن اور غیر اہم ہونے کا احساس ہو رہا تھا جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آچکی تھی، گیتا بالی نے شاید وہ بھی دیکھ لی تھی۔ انہوں نے خود بھی فلم انڈسٹری میں مقام بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کی تھی اور وہ دل شکستگی کے کئی مراحل سے گزری تھیں، انہیں شاید اندازہ تھا کہ جتن اس وقت کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔

''تم خوش نظر نہیں آ رہے؟'' گیتا نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

جتن سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ کیا اس عورت کو اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اس سے کتنی امیدیں وابستہ کرلی تھیں؟ میں نے تو اپنے آپ کو اس کی اس پنجابی فلم کا ہیرو تصور کرلیا تھا جس کی لانچنگ پارٹی میں آج میں ایک غیر اہم سے مہمان کے طور پر بیٹھا تھا۔ گیتا خود اپنے کیریئر کے دوران کئی بار مسترد کیے جانے کے صدمے سے گزر چکی تھیں، شاید وہ اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں۔

''ذرا آسمان کی طرف دیکھو۔'' گیتا بالی نے اچانک جتن کو ہدایت کی۔

جتن کے لئے یہ الفاظ قطعی غیر متوقع تھے لیکن وہ بہرحال اس ہدایت پر عمل کیے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا تو گیتا بولی ''دیکھ رہے ہو...... آسمان پر کتنے ستارے جگمگا رہے ہیں؟ ایک دن تم بھی شہرت کے آسمان پر ان ستاروں کی طرح جگمگاؤ گے، تمہیں جتنی شہرت کی تمنا ہے اس سے کہیں زیادہ ملے گی۔''

گیتا بالی کے لہجے میں خلوص بول رہا تھا، جتن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلاہٹ بڑھ گئی، انہوں نے بولنے کی کوشش کی تو آواز بھی مشکل سے ان کے حلق سے نکلی ''مجھے جب بھی کامیابی ملی، میں سب سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔''

جتن اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکے، وہ جب جتن سے راجیش کھنہ بنے اور شہرت نے ان کے قدم چومے تو وہ گیتا بالی کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے...... کیونکہ اس وقت تک گیتا بالی کا انتقال ہو چکا تھا۔

گیتا بالی سے پارٹی میں ملاقات کے بعد جتن اپنی تھیٹر کی مصروفیات کی طرف لوٹ آئے، تھیٹر میں ان کے ساتھ کام کرنے والے دو افراد گرنام اور پرشانت آگے چل کر راجیش کھنہ کے اسسٹنٹ اور منیجر بھی بنے۔ کالج کے ڈراموں کے دوران ایک بار جتن کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، جسے وہ عرصے تک فراموش نہیں کر سکے۔ وہ ایک ڈرامے کی ریہرسل کر رہے تھے، جسے وی کے شرما ڈائریکٹ کر رہے تھے، جس دن ڈرامے کا پہلا شو ہوا اور جتن اسٹیج پر آئے تو ایک مخالف گروپ جس نے پہلے سے سازش تیار کی ہوئی تھی، اس نے جتن پر کیلے کے چھلکے اور انڈے پھینکے، انہوں نے جتن کو پرفارم ہی نہیں کرنے دیا اور ڈرامے کا پہلا شو برباد ہوگیا۔

جتن اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ دوستوں کے پاس پہنچ کر باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس ڈرامے کے لئے اتنی محنت کی تھی، وہ سب ضائع ہوگئی۔ اس روز وہ بطور اداکار اپنے مستقبل سے بھی بالکل مایوس ہوگئے۔ ڈائریکٹر وی کے شرما، پرشانت اور گرنام نے انہیں بہت تسلیاں دیں۔ انہوں نے پتہ چلایا کہ صرف ایک لڑکا جس کا نام پائی تھا، اس ساری سازش کا ذمہ دار تھا۔ جتن کے تینوں ساتھی انہیں اپنے ہمراہ لے کر پائی کی تلاش میں نکلے، وہ جتن کی دلجوئی کے لئے پائی کو سبق سکھانے کے لئے نکلے تھے۔ جتن کی گاڑی میں وہ چاروں دن بھر پائی کو تلاش کرتے رہے، پائی تو ان کے ہاتھ نہ آیا لیکن ان کی اس حمایت سے جتن کو بہت حوصلہ ملا اور ان کا دل ہلکا ہوگیا۔ وہ ان کے اتنے شکرگزار ہوئے کہ تینوں کو باری باری ان کے گھر چھوڑنے گئے۔ مشہور فلمی ہیرو بن جانے کے بعد بھی کئی بار انہوں نے اس واقعے کا ذکر کیا۔ شاید یہ بھی اس واقعے ہی کا اثر تھا کہ بعد میں انہوں نے گرنام اور پرشانت کو اپنے اسسٹنٹ اور منیجر کے طور پر ملازم رکھا۔

(جاری ہے)

شرمیلا ٹیگور اور راجیش کھنہ
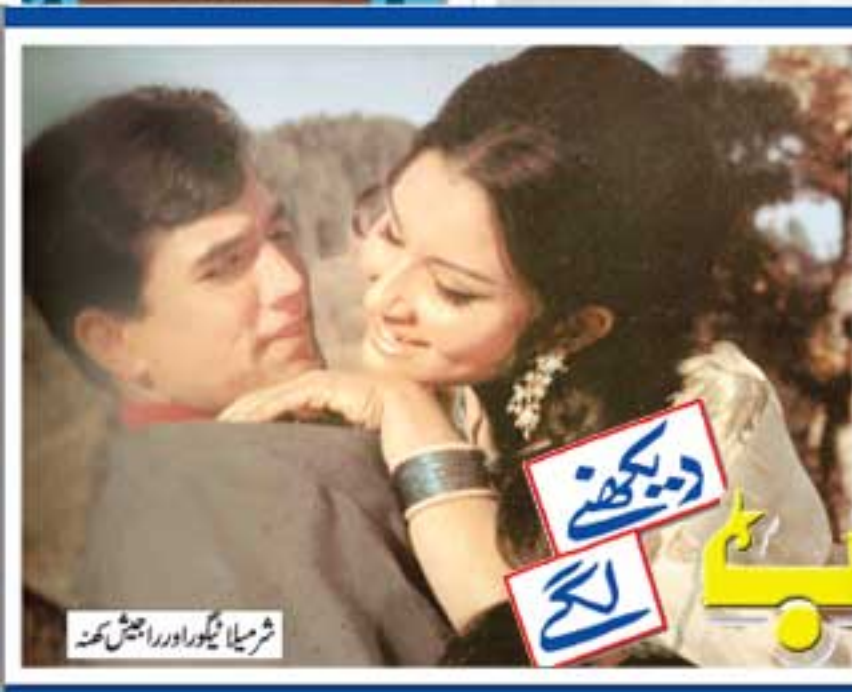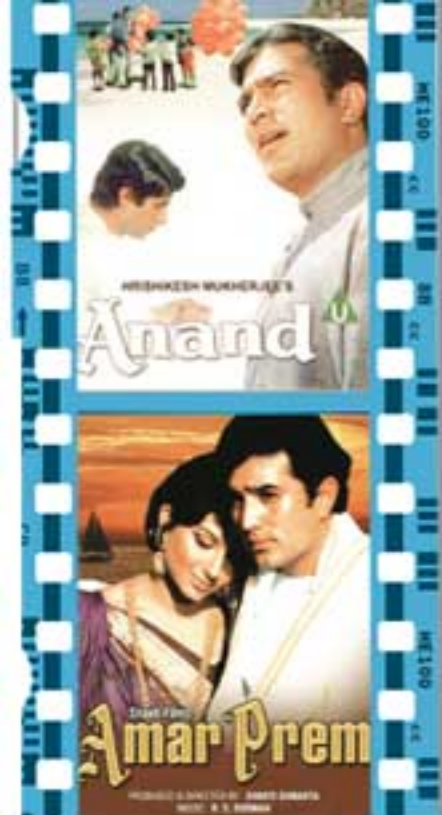
راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

وہ جاگتی آنکھوں سے سنہرے خواب دیکھنے لگے

قسط:5

جتین کے لئے قسمت نے قطعی غیر متوقع طور پر ایک موقع پیدا کر دیا۔ بولی وڈ کے بہت سے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز نے مل کر "یونائیٹڈ پروڈیوسرز گلڈ" کے نام سے ایک تنظیم بنالی۔ اس میں جی پی سپی، شکتی سامنتا اور بی آر چوپڑا جیسے لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں نے انڈیا کے مشہور اخباری ادارے "ٹائمز آف انڈیا گروپ" جس کے زیر انتظام معروف فلمی رسالہ "فلم فیئر" بھی شائع ہوتا تھا، کے ساتھ مل کر فلموں کے لئے نئے چہروں کی تلاش کے سلسلے میں 1965ء میں ایک مقابلہ منعقد کرایا۔

آج کے دور میں تو ٹی وی چینلز پر گلوکاری، اداکاری اور ڈانس وغیرہ کے سلسلے میں بہت سے مقابلے منعقد ہوتے رہتے ہیں جو باقاعدہ دلچسپ شوز کی صورت میں چلتے ہیں اور ان کے ذریعے نیا ٹیلنٹ بھی سامنے آتا رہتا ہے لیکن 1960ء کی دہائی میں نئے فنکاروں کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے ایسے پلیٹ فارم میسر نہیں تھے جن کے ذریعے وہ پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کی نظر میں آسکتے۔ چنانچہ پروڈیوسرز اور اخباری گروپ کے اشتراک سے اس قسم کے مقابلے کا اعلان خوش آئند تھا۔ جن اشتہاروں کے ذریعے ان مقابلوں کا اعلان کیا گیا، ان میں بتایا گیا تھا کہ فائنل مقابلہ جیتنے والے امیدواروں کو ان پروڈیوسرز کی آئندہ فلموں میں رول دیئے جائیں گے جو "یونائیٹڈ پروڈیوسرز گلڈ" میں شامل تھے۔

اس دوران انجو مہندرو سے جتین کی کافی دوستی ہو چکی تھی۔ انجو نے جتین پر زور دیا کہ وہ اس مقابلے میں شرکت کے لئے فارم بھر دیے۔ چنانچہ ہزاروں دوسرے امیدواروں کے ساتھ جتین نے بھی فارم بھر دیا۔ انہوں نے اپنی بہت سی نئی تصویریں کھنچوا کر اور ان میں سے بہترین تصویریں منتخب کر کے، اس فارم کے ساتھ منسلک کیں۔ اس بار قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آڈیشن اور ابتدائی مراحل کامیابی سے طے کرنے بعد فائنل راؤنڈ کے لئے شارٹ لسٹ ہو گئے۔

جتین فائنل راؤنڈ کے لئے منتخب تو ہو گئے لیکن جوں جوں فائنل راؤنڈ کا دن قریب آنے لگا، ان کی گھبراہٹ بڑھنے لگی۔ ان کے لئے کھانا پینا، راتوں کو سونا مشکل ہو گیا۔ ہر وقت یہی سوال انہیں سانپ کی طرح ڈستا رہتا کہ کیا وہ فائنل راؤنڈ میں کامیاب ہو سکیں گے؟ انہیں یوں لگتا جیسے وہ فائنل راؤنڈ میں ناکام ہو گئے تو اس کے بعد ان کی زندگی میں اندھیروں کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور لوگ نہ جانے ان کا کتنا مذاق اڑائیں گے۔ انہیں لگتا یہی تھا کہ وہ فائنل راؤنڈ میں ناکام ہو جائیں گے۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے بھی اس سلسلے میں بات کی۔ ہر ایک نے انہیں حوصلہ دیا اور یقین دلایا کہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے لیکن نہ جانے کیوں انہیں یقین نہیں آتا تھا۔

فائنل والے دن انہوں نے علی الصباح اٹھ کر اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر اپنے آپ کو یقین دلانا شروع کیا کہ وہ فائنل راؤنڈ میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے بہت دیر تک اپنی کامیابی کے لئے دعائیں بھی کیں۔ حالانکہ انہیں اسٹیج پر کام کرنے کا تجربہ بھی تھا۔ وہ اداکاری کے میدان میں بالکل ہی نووارد نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہیں فائنل راؤنڈ کا مرحلہ بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مقابلے میں جج وہی ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز ہوں گے جن کے دفتروں کے جتین نے کئی بار چکر لگائے تھے لیکن سیکورٹی گارڈز نے انہیں اندر نہیں جانے دیا تھا اور آخرکار کسی نہ کسی طرح صرف اپنی تصویریں اندر بھجوا کر واپس آگئے تھے اور انتظار کرتے رہے تھے کہ شاید کہیں سے بلاوا آجائے لیکن کبھی کہیں سے بلاوا نہیں آیا تھا۔ آج وہ ان سب کے سامنے پیش ہونے جا رہے تھے۔

آخرکار وہ جب مقررہ جگہ پر پہنچے تو ایک کشادہ ہال میں بڑی بڑی میزوں کے گرد بارہ تیرہ افراد ان کے منتظر تھے۔ وہ سب ساکت بیٹھے، پلکیں جھپکائے بغیر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جتین کو یوں لگا جیسے وہ فلم ڈائریکٹرز نہیں بلکہ فائرنگ اسکواڈ کے لوگ تھے اور کسی بھی لمحے انہیں گولیوں سے چھلنی کرنے والے تھے۔ جتین کو ایک اسکرپٹ دیا گیا تھا جس میں سے چند منتخب مکالمے انہیں بولنے تھے۔ مکالمے ایک ایسے نوجوان کے تھے جو اپنی ماں کو بتا رہا تھا کہ وہ فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

جب جتین کو مکالمے بولنے کے لئے کہا گیا تو انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے سامنے بیٹھے، اس زمانے کے مشہور فلم میکر بی آر چوپڑا سے کہا۔ "مجھے یہ مکالمے تو دے دیے گئے ہیں لیکن ان کے ساتھ میرے کردار کی وضاحت نہیں ہے کہ میں کون ہوں۔ میں ہیرو ہوں، ولن ہوں، مزدور ہوں، ڈاکٹر ہوں یا دکاندار ہوں؟ کیونکہ کردار کے حساب سے اداکار کے مکالموں کی ادائیگی کا انداز بدل جاتا ہے۔ اگر آپ کردار کی ذرا وضاحت کر دیں تو میں اسی مناسبت سے مکالمے ادا کروں۔"

پہلے تو بی آر چوپڑا سخت نگاہوں سے جتین کو گھور کر بولے۔ "تم کچھ زیادہ ہی ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"

جتین کے جسم سے پہلے ہی گھبراہٹ کے مارے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ بی آر چوپڑا کے انداز پر وہ اندر ہی اندر اور زیادہ بدحواس ہو گئے لیکن دوسرے ہی لمحے بی آر چوپڑا اپنا انداز بدلتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ "مسٹر جتین! تم اسٹیج کے اداکار ہو۔ چلو، اس اسکرپٹ کو چھوڑو۔ تم نے اسٹیج پر کسی رول میں جو مکالمے اپنے خیال میں بہت اچھی طرح بولے ہوں، ہمیں وہ سنا دو۔"

یہ بات سن کر اور بی آر چوپڑا کا بدلا ہوا انداز دیکھ کر جتین کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے اور چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے اعصاب کو ذرا سکون میں لانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ذہن پر زور ڈال کر، اسٹیج پر اپنا ادا کیا ہوا کوئی کردار اور مکالمے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ذہن کے پردے پر کئی اسٹیج ڈراموں کے مناظر ابھرے لیکن وہ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ تاہم چند سیکنڈ میں وہ ایک کردار اور اس کے مکالمے منتخب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

پھر وہ آنکھیں کھول کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے باقاعدہ ایکشن کے ساتھ وہ مکالمے بولے۔ مکالمے ذرا طویل تھے اور وہ ان میں کھو کر رہ گئے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئے تب گویا انہیں یاد آیا کہ وہاں دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب دم بخود ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے تاثرات نے جتین کو بتا دیا کہ وہ ان کی اداکاری اور ڈائیلاگ ڈلیوری سے کس قدر متاثر تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ جتین نے مقابلہ جیت لیا۔

پرانے فلمساز جے۔ اوم پرکاش بتاتے ہیں۔ "اس مقابلے میں راجیش کھنہ کو در حقیقت میں نے منتخب کیا تھا لیکن میں نے دوسروں کو بھی اپنے فیصلے میں شریک کیا تھا۔ ہمیں اپنے انتخاب پر ہمیشہ فخر رہا۔"

پروڈیوسرز گلڈ نے اس سے اگلے سال بھی یہ مقابلہ منعقد کرایا تھا۔ اس میں بھی اداکار بننے کے ہزاروں خواہشمندوں نے بڑے ارمانوں سے حصہ لیا تھا۔ اس مقابلے میں حصہ لینے والوں میں امیتابھ بچن بھی شامل تھے۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ امیتابھ بچن یہ مقابلہ نہیں جیت سکے تھے۔

چند دن بعد جب جتین کو پروڈیوسرز گلڈ کی طرف سے خط ملا تو انہوں نے دھڑکتے دل

سری دیوی کے ساتھ

کے ساتھ، کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ اس خط میں انہیں مقابلہ جیتنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب آنسوؤں کی دھندلاہٹ ختم ہوئی تو انہوں نے جاگتی آنکھوں سے، جانے کیا کیا خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ چند لمحوں میں انہوں نے خیالوں ہی خیالوں میں برسوں کی ترقی کا سفر طے کر لیا۔ چشمِ تصور سے انہوں نے دیکھا کہ وہ ملک کے مقبول ترین فلمی ہیرو بن گئے ہیں۔ ان کے دروازے پر فلم پروڈیوسرز کا ہجوم ہے، دنیا ان کی دیوانی ہے اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کے وہ آئیڈیل بن چکے تھے۔

ان کے یہ خواب، خواب ہی رہے۔ دن پہ دن گزرتے چلے گئے اور انہیں کسی بھی پروڈیوسر کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔ ان کی روشن آنکھوں میں امید کے ستارے ماند پڑنے لگے اور دل میں مایوسی کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس دوران کئی بار مختلف ڈائریکٹرز نے ان کے اسکرین ٹیسٹ بھی لئے لیکن ان کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ایک بار اچانک پروڈیوسر جی پی سپی کو یاد آیا کہ ان کے سامنے جتین نامی ایک نوجوان کا اسکرین ٹیسٹ ہوا تھا۔ ان کے ذہن میں کوئی خیال آیا اور انہوں نے اپنے بیٹے رمیش سپی (جنہیں مشہور فلم "شعلے" کے ڈائریکٹر پروڈیوسر کی حیثیت سے زیادہ جانا جاتا ہے) سے کہا کہ انہیں اس اسکرین ٹیسٹ کے پرنٹ دوبارہ دکھائے جائیں۔

دوبارہ پرنٹ دیکھ کر وہ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "تم اسے ہماری آئندہ فلم میں سائن کر لو۔ ہمیں اس فلم کے لئے کسی نئے چہرے کی تلاش تھی۔ اس سے اچھا نیا چہرہ اس وقت دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا۔"

بیٹے نے باپ کی ہدایت پر عمل کیا۔ یوں جی پی سپی کی جوہر شناس نظروں کی بدولت جتین کو ان کی زندگی کی پہلی فلم "راز" کے لئے سائن کیا گیا۔ ایک فلم میں سائن ہونے کی وجہ سے شاید ان کی شہرت اسٹوڈیوز میں پھیلنے لگی کہ فلم کے افق پر کوئی نیا چہرہ نمودار ہونے والا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد ہدایتکار چیتن آنند ان کے پاس پہنچے اور انہوں نے اپنی فلم "آخری خط" کے لئے انہیں سائن کر لیا۔ چیتن آنند مشہور اداکار دیو آنند کے بھائی تھے۔ دیو آنند نے "نوکیتن فلمز" کے نام سے فلمساز ادارہ بھی قائم کیا ہوا تھا۔ اس پروڈکشن ہاؤس کے تحت بننے والی فلموں کے لئے کئی سال تک ڈائریکٹر کے فرائض چیتن آنند ہی انجام دیتے رہے۔

"راز" کی شوٹنگ جلد شروع ہونے والی تھی جبکہ "آخری خط" کے لئے ابھی کوئی شوٹنگ شیڈول طے نہیں ہوا تھا۔ جتین کو بتایا گیا کہ "راز" کی شوٹنگ صبح نو بجے شروع ہوا کرے گی جس کے لئے انہیں آٹھ بجے سیٹ پر موجود ہونا چاہئے۔ یہ سن کر جتین کے ہوش اڑ گئے۔ آٹھ بجے سیٹ پر موجود ہونے کا مطلب تھا کہ جتین کو صبح چھ بجے بستر چھوڑ دینا چاہئے تھا جبکہ جتین کی خاص عادت تھی کہ وہ زندگی میں کبھی صبح جلدی نہیں اٹھے تھے۔

انہوں نے کالج میں کبھی پہلا پیریڈ اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ ان کی والدہ نے بھی ہمیشہ ان کے ناز اٹھاتے ہوئے ان کی اس عادت کو پختہ کرنے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ صبح کسی کو ان کے کمرے میں جانے نہیں دیتی تھیں اور گھر میں اس وقت تک کوئی کھٹر پٹر نہیں ہوتی تھی جب تک جتین بیدار نہ ہو جاتے۔ دیر سے اٹھنے کی اپنی اس عادت کو بدلنا اب جتین کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب ان کے سامنے ایک بہت بڑا سوال ناگ کی طرح پھن اٹھائے کھڑا تھا...... اور وہ یہ کہ اگر وہ اپنی عادت نہیں بدلیں گے تو پھر "راز" میں کام کیسے کریں گے؟

(جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

پہلی چار فلمیں فلاپ ہونے پر وہ

بالکل مایوس ہو گئے

فریدہ جلال کے ساتھ

تمکین تبسم
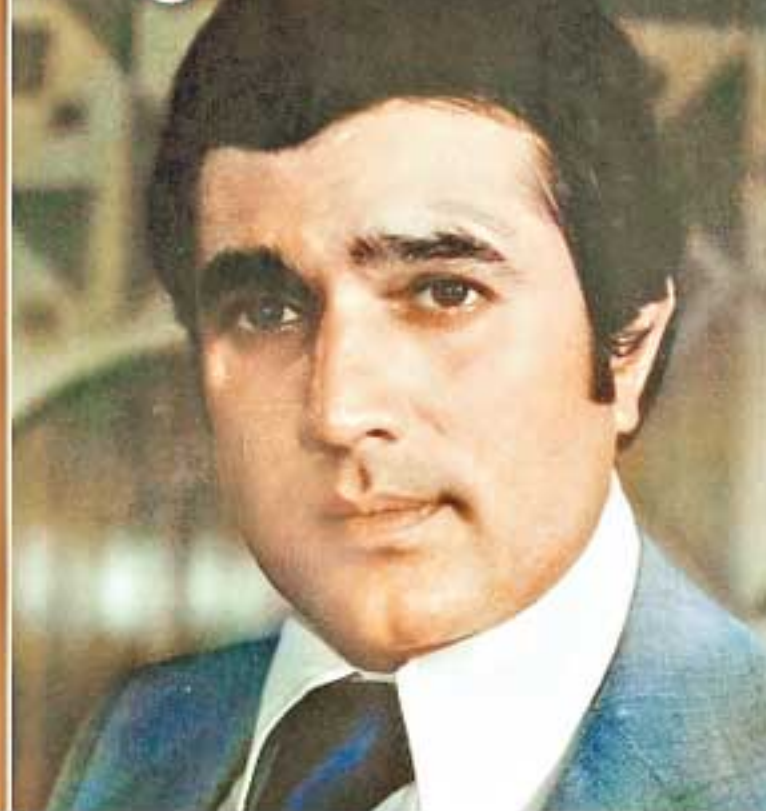
قسط : 7

"بہاروں کے سپنے" کی ہیروئن آشا پاریکھ کے مقابلے میں ہیرو راجیش کھنہ نئے تھے اور مارکیٹ ویلیو کے اعتبار سے ان کا نام بڑا نہیں تھا لیکن فلم میں راجیش کھنہ کو پسند کیا گیا۔ وہ اپنی شکل صورت اور اسٹائل سے ایک چاکلیٹی ہیرو دکھائی دیے۔ فلم کی موسیقی بھی عمدہ تھی۔ موسیقار آر ڈی برمن کا وہ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ان کی موسیقی میں فلم کے تین نغمے تو خاص طور پر بہت پسند کیے گئے جو مجروح سلطان پوری نے لکھے تھے۔

☆ آجا پیا توہے پیار دوں

☆ کیا جانوں ساجن ہوتی ہے کیا غم کی شام

☆ چنری سنبھال گوری......

اس فلم کے بعد راجیش کھنہ کی بہت سی فلموں کی موسیقی آر ڈی برمن نے دی لیکن بدقسمتی سے راجیش کھنہ کی پہلی دو فلموں کی طرح "بہاروں کے سپنے" بھی فلاپ ہو گئی۔ یہی نہیں، بلکہ ان کی چوتھی فلم "عورت" بھی اسی انجام سے دوچار ہوئی۔ کسی نئے اداکار کی اگر ابتدائی چار فلمیں ہی اوپر تلے فلاپ ہو جائیں تو پھر کوئی فلم میکر اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا لیکن راجیش کھنہ پر قسمت مہربان تھی۔ چار فلمیں فلاپ ہونے کے بعد بھی فلمساز انہیں سائن کرتے رہے۔ جن فلموں میں انہیں سائن کیا گیا، ان میں شکتی سامنتا کی "ارادھنا" اور راج کھوسلہ کی "دو راستے" بھی تھی۔

راجیش کھنہ نے جب اداکاری کے مقابلے میں حصہ لیا تھا، اس وقت ججوں میں اس زمانے کے مشہور ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بی آر چوپڑا بھی شامل تھے۔ مقابلے میں ججوں کے فرائض انجام دینے والے ان فلم میکرز نے یہ وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ جیتنے والے اداکاروں کو اپنی فلموں میں کام کرنے کا موقع دیں گے۔ فلمساز ادارے "بی آر فلمز" کے مالک بی آر چوپڑا کی طرف سے ابھی تک یہ وعدہ وفا کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ اس زمانے میں فلم "آدمی اور انسان" بنا رہے تھے جس کی کاسٹ میں دھرمیندر، فیروز خان اور سائرہ بانو شامل تھے۔

اس فلم کی تکمیل میں تاخیر ہو رہی تھی کیونکہ سائرہ بانو کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی اور وہ لندن میں زیر علاج تھیں۔

"آدمی اور انسان" کے ڈائریکٹر، بی آر چوپڑا کے چھوٹے بھائی یش چوپڑا تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سائرہ بانو کی صحت یابی کے انتظار میں وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اس فارغ وقت کو استعمال کرنے کے لیے انہوں نے کم بجٹ کے ساتھ، ہنگامی انداز میں ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنایا۔ طے پایا کہ صرف ایک ماہ میں، ایک ہی سیٹ پر اس فلم کو مکمل کیا جائے گا۔ اس فلم کا نام "اتفاق" رکھا گیا اور ہیرو کے لیے بی آر چوپڑا کی نظرِ انتخاب راجیش کھنہ پر پڑی۔ انہوں نے سوچا، اس طرح ان کا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا۔

جس وقت راجیش کھنہ کو "اتفاق" میں کاسٹ کیا گیا، وہ اپنی دوسری دونوں فلموں "ارادھنا" اور "دو راستے" کی شوٹنگ تقریباً مکمل کر چکے تھے لیکن "اتفاق" ان دونوں سے پہلے مکمل ہو کر 4 راکتوبر 1969ء کو ریلیز بھی ہو گئی۔ نندا اس فلم میں راجیش کھنہ کی ہیروئن تھیں۔ قسمت کا کھیل دیکھیے کہ راجیش کھنہ کی پچھلی چار فلموں کے مقابلے میں اس فلم میں ان کے کام نے نقادوں اور شائقین کو زیادہ متاثر کیا۔ وہ فلم جو صرف ایک سیٹ پر، نہایت کم بجٹ کے ساتھ، ایک ماہ میں مکمل کی گئی، راجیش کھنہ کے کیریئر میں زیادہ اہم سنگِ میل ثابت ہوئی۔ درحقیقت یہی راجیش کھنہ کی کامیابیوں کا نقطۂ آغاز تھا۔

"ارادھنا" بھی کچھ اسی قسم کی فلم تھی اور اس سے ملتے جلتے حالات میں ہی راجیش کھنہ کو اس کے لیے سائن کیا گیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ پروڈیوسر ڈائریکٹر شکتی سامنتا ان دنوں بڑے شوق اور جوش و خروش سے بنائی ہوئی اپنی فلم "ایوننگ ان پیرس" سے نمٹ کر بیٹھے تھے۔ شمی کپور اور شرمیلا ٹیگور اس کے ہیرو، ہیروئن تھے۔ پیرس کی خوبصورت لوکیشنز پر شوٹ کی گئی یہ فلم ناچ گانوں اور دیگر تفریحی لوازمات سے بھرپور تھی۔ شرمیلا ٹیگور نے اس فلم میں بکنی پہنی تھی جو اس زمانے کے لحاظ سے خاصی دھوم مچانے والی بات تھی مگر ان تمام تجربات کے باوجود کاروباری طور پر یہ ایک درمیانے درجے کی فلم رہی۔ اس نے اتنی ہلچل نہیں مچائی جتنی شکتی سامنتا توقع کر رہے تھے۔ انہیں قدرے مایوسی ہوئی۔

اس کے فوراً بعد وہ ایک بڑے بجٹ کی فلم "جانے انجانے" بنانا چاہ رہے تھے۔ اس میں بھی وہ شمی کپور کو ہی ہیرو لینا چاہتے تھے جو ان دنوں دوسری فلموں میں بہت زیادہ مصروف تھے اور ان پر کچھ موٹاپا بھی آیا ہوا تھا۔ شکتی سامنتا چاہتے تھے کہ وہ اپنا وزن کچھ کم کریں۔ چنانچہ انہیں "جانے انجانے" شروع کرنے کے لیے کچھ انتظار کرنا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس وقفے کے دوران جلدی سے، چھوٹے بجٹ کی کوئی فلم بنا لی جائے۔ یہ فلم "ارادھنا" تھی جس کی کہانی درحقیقت ہیروئن کے گرد گھومتی تھی۔ ہیرو کا کردار زیادہ اہم نہیں تھا۔ اسے صرف فلم کے انٹرویل تک زندہ رہنا تھا۔

اس کردار کے لیے کوئی نیا اداکار ہی خوشی سے تیار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قرعۂ فال راجیش کھنہ ہی کے نام نکلا۔ شکتی سامنتا انہیں فلم "بہاروں کے سپنے" میں دیکھ چکے تھے اور انہیں وہ اسکرین پر اچھے لگے تھے۔ ان کے بلاوے پر راجیش کھنہ حسبِ توقع خوش ہوئے۔ وہ اپنی چار فلمیں فلاپ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی سہمے بیٹھے تھے کہ نہ جانے اب کوئی انہیں کاسٹ بھی کرے گا یا نہیں؟ ایسے میں انہیں شکتی سامنتا کی طرف سے بلاوا آ گیا تھا جن کا نام بطور پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بہت بڑا تھا۔

ہیروئن کے لیے شکتی سامنتا نے اپرنا سین سے بات کر لی تھی لیکن شوٹنگ شروع ہونے کے دن قریب آئے تو پتا چلا کہ اپرنا سین کے پاس ڈیٹس نہیں تھیں۔ شکتی سامنتا کو شرمیلا ٹیگور سے رجوع کرنا پڑا۔ اس دوران شرمیلا ٹیگور کی نواب پٹودی سے منگنی ہو چکی تھی اور وہ اپنا "ایوننگ ان پیرس" والا تاثر ختم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ اور "صاف ستھرا" رول کرنا چاہتی تھیں، اس لیے وہ بھی خوشی سے راضی ہو گئیں۔ راجیش کھنہ کو جب پتا چلا کہ ان کی ہیروئن شرمیلا ٹیگور ہوں گی۔ تو ان کی خوشی اور بڑھ گئی۔

فلم کی شوٹنگ شروع ہونے میں چند دن باقی تھے کہ فلم اور راجیش کھنہ، دونوں کی قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا۔ پروڈیوسر سریندر کپور (انیل کپور کے والد) شکتی سامنتا کے دوست تھے۔ ان کی فلم "ایک شری مان ایک شریمتی" حال ہی میں مکمل ہوئی تھی۔ انہوں نے ریلیز سے پہلے یہ فلم دیکھنے کے لیے شکتی سامنتا کو مدعو کیا۔ اس زمانے میں اکثر فلم میکرز جو آپس میں دوست ہوتے تھے، اپنی فلم کی ریلیز سے پہلے اس کے بارے میں رائے لینے کے لیے ایک دوسرے کو مدعو کرتے تھے۔

شکتی سامنتا اسٹوڈیو پہنچ کر اطمینان سے فلم دیکھنے بیٹھ گئے۔ فلم جب اختتام کے قریب پہنچی تو شکتی سامنتا کا سکون اور اطمینان رخصت ہو گیا کیونکہ اختتام وہی تھا جو ان کی فلم "ارادھنا" کا تھا جس کی شوٹنگ وہ چند دن میں شروع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دراصل دونوں فلموں کے رائٹر ایک ہی تھے جن کا نام سچن بھومک تھا۔ نہ جانے کیوں انہوں نے دونوں فلموں کا کلائمکس ایک ہی جیسا لکھ دیا تھا۔ شکتی سامنتا اپنے دفتر واپس آئے تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آخر انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ انہیں "ارادھنا" بنانے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔ اس فلم نے ان کا ذہنی سکون لوٹ لیا تھا۔ اس کے بارے میں ہر چند دن بعد کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔

ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ دو فلمی مصنف گلشن نندہ اور مدھوسودن کلکران سے ملنے اور نئی فلمی کہانیوں پر تبادلۂ خیال کرنے ان کے دفتر آ گئے۔ شکتی سامنتا نے انہیں اپنا تازہ ترین مسئلہ بتایا۔ گلشن نندہ نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ ابھی معاملہ ہاتھ سے نہیں نکلا، اسکرپٹ میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ شکتی کو اس بات سے اطمینان نہیں ہوا تو گلشن نندہ نے کہا کہ ان کے پاس ایک نیا اسکرپٹ بھی موجود ہے، اگر "ارادھنا" کے اسکرپٹ میں تبدیلی کی تجویز ان کے دل کو نہیں لگ رہی تو وہ نئی کہانی پر بھی فلم بنا سکتے ہیں۔ گلشن نندہ نے اس نئی کہانی کا عنوان "کٹی پتنگ" رکھا تھا اور ان کا خیال تھا کہ اس پر اسی نام سے فلم بنائی جا سکتی تھی۔

اس رات ان تینوں افراد کے درمیان زور و شور سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا جس کے دوران شکتی سامنتا، گلشن نندہ کی تجویز سے متفق ہو گئے۔ پہلے "ارادھنا" کا انجام تبدیل کیا گیا۔ اس کے بعد "کٹی پتنگ" کی کہانی سنی گئی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت ہوئی۔ "ارادھنا" میں راجیش کھنہ پائلٹ کا رول کر رہے تھے جسے انٹرویل سے پہلے مر جانا تھا۔ اس کے بعد فلم کے باقی آدھے حصے میں ان کے بیٹے کی کہانی تھی۔ بیٹے کا کردار کسی اور اداکار کو کرنا تھا لیکن گلشن نندہ نے شکتی سامنتا کو مشورہ دیا کہ بیٹے کا کردار بھی راجیش کھنہ سے ہی کرایا جائے۔

شکتی نے یہ تجویز مان لی۔ یوں ایک رات میں کئی کام ہو گئے۔ "ارادھنا" کا انجام تبدیل ہو گیا اور شکتی کی پریشانی دور ہو گئی۔ اس فلم میں راجیش کھنہ کا ڈبل رول ہو گیا، ان کا کام بڑھ گیا اور اسکرین پر ان کی موجودگی کا دورانیہ بڑھ گیا، جو راجیش کھنہ کے لیے خوشی کی بات تھی۔ یوں نہ صرف "ارادھنا" کا اسکرپٹ ضائع ہونے سے بچ گیا بلکہ پہلے سے زیادہ کارآمد ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور فلم "کٹی پتنگ" کا پروگرام بھی بن گیا۔ ان دونوں فلموں کے ہیرو راجیش کھنہ تھے اور انہی سے ان کے عروج کا دور شروع ہونے جا رہا تھا۔

"ارادھنا" مکمل ہوئی تو ممبئی کے ایک نہایت معیاری سینما "اوپیرا ہاؤس" میں اس کا پریمیئر شو رکھا گیا جس میں چیدہ چیدہ اہم شخصیات کے علاوہ فلم انڈسٹری کے بھی بہت سے جانے پہچانے چہروں کو مدعو کیا گیا۔ فلم کے ہیرو راجیش کھنہ مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے سینما ہال کے دروازے پر کھڑے تھے۔ بڑے بڑے فلمی ستارے یہ فلم دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔ ان میں سدابہار فلم اسٹار دیو آنند بھی تھے۔ انہوں نے کچھ زیادہ ہی گرمجوشی سے راجیش کھنہ سے ہاتھ ملایا۔

دیو آنند نے برسوں فلمی دنیا پر راج کیا تھا۔ راجیش کھنہ اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ دیو آنند سے ان کی فلم "جیول تھیف" کے سیٹ پر ملے تھے۔ وہ وہاں اپنی دوست، اداکارہ انجو سے ملنے گئے تھے جو اس فلم میں کوئی چھوٹا موٹا رول کر رہی تھیں۔

راجیش کھنہ اسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھ رہے تھے کہ دیو آنند جیسا سپر اسٹار اور سدا بہار ہیرو ان کی فلم دیکھنے آیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ دیو آنند نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرنے کے علاوہ ناقدانہ سی نظروں سے ان کا سرتاپا جائزہ بھی لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ راجیش کھنہ ایک طرح سے دیو آنند کے بھائی چیتن آنند کی دریافت تھے۔

پریمیئر شو، ظاہر ہے، منتخب لوگوں کے لیے تھا جنہیں باقاعدہ دعوت دے کر بلایا گیا تھا، اس کا کوئی ٹکٹ وغیرہ نہیں تھا۔ فلم ابھی ریلیز بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ فلم شروع ہوئی تو تمام حاضرین اسے دیکھنے میں منہمک ہو گئے۔ لوگ پوری توجہ سے فلم دیکھ رہے تھے لیکن راجیش کھنہ نیم تاریک ہال کے ایک گوشے میں کھڑے ان کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ان کی پہلی بڑی فلم تھی اور بہت خاص لوگ اسے دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ راجیش اندازہ لگانا چاہ رہے تھے کہ ان کی اس فلم کے بارے میں لوگ کیا محسوس کر رہے تھے، کیا رائے قائم کر رہے تھے لیکن انہیں کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ ہال کی لائٹس آف تھیں۔ صرف سینما کی اسکرین سے تھوڑی بہت روشنی کچھ لوگوں کے چہروں تک پہنچ رہی تھی۔ راجیش کو یوں لگا جیسے ان کا مستقبل بھی اس گھٹتے بڑھتے اندھیرے اُجالے میں ہی اِدھر اُدھر کہیں بھٹک رہا تھا......

(جاری ہے)

ریکھا اور راجیش

زینت امان کے ساتھ

قسط نمبر 8

ملگجے اندھیرے میں راجیش کھنہ کی بھٹکتی ہوئی نظریں دوسرے لوگوں کے چہروں سے ہوتی ہوئی آخر کار دیو آنند کے چہرے پر آکر ٹھہر گئیں۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دیو آنند نہایت توجہ اور انہماک سے ان کی فلم دیکھ رہے تھے۔ راجیش کھنہ یونہی کبھی لوگوں کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کرتے رہے اور کبھی اپنے خیالات میں کھوئے رہے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا کہ کب فلم ختم ہوگئی۔ لائٹس آن ہوئیں تو راجیش کھنہ نے محسوس کیا کہ سنیما ہال کی فضا میں زبردست جوش و خروش تھا۔ لوگوں نے آکر انہیں مبارکباد دینا شروع کردی، سب نے ان کیلئے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور دعائیں دیں۔

دیو آنند ان کے پاس آئے تو ان کا انداز سب سے الگ تھا۔ انہوں نے پرجوش مصافحہ کیا۔ پھر راجیش کا کندھا تھپک کر بولے "جاؤ، گھر جاکر آرام سے سو جاؤ، سمجھ لو تم سپر اسٹار بن چکے ہو۔"

اس میں شک نہیں کہ دیو آنند کے ان الفاظ سے راجیش کو بہت حوصلہ ملا، لیکن اس کے بعد بھی کامیابی کا سفر ان کیلئے آسان ثابت نہیں ہوا۔ جب "ارادھنا" کی ریلیز کا وقت آیا تو کوئی ڈسٹری بیوٹر اسے اٹھانے کیلئے تیار نظر نہ آیا۔ وہ لوگ ہچکچاہٹ کا شکار تھے کہ نہ جانے ایک نئے ہیرو کی فلم چلے گی یا نہیں؟ شرمیلا ٹیگور کے نام میں البتہ ان لوگوں کیلئے کشش تھی لیکن فلم میں ان کا کردار بھی جوانی سے بڑھاپے تک کا تھا اور گلیمر سے عاری تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح "ارادھنا" کو ممبئی کے نہایت معیاری سنیما ہاؤس "راکسی" میں ریلیز کردیا گیا۔ فلم کے گانے پہلے ہی ریلیز ہوچکے تھے اور پسند کئے جارہے تھے۔

فلم کی کہانی کا موضوع اس زمانے کے لحاظ سے خاصا بولڈ تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ پریمیئر شو میں فلم انڈسٹری کے سب لوگوں نے فلم کو بہت سراہا تھا اور وہ اس کے بارے میں بہت زیادہ پرامید نظر آئے تھے لیکن فلم کی ریلیز کے بعد پہلا شو ہی بہت ٹھنڈا دکھائی دے رہا تھا۔ شکتی سمانتا خود اس شو میں موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہال کھچا کھچ نہیں بھرا تھا اور جو لوگ فلم دیکھ کر جارہے تھے، وہ زیادہ خوش یا پرجوش دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ فلم ختم ہوئی تو شکتی سمانتا خاصی مایوسی کے عالم میں سنیما گھر سے باہر آئے۔

انہیں پتا چلا کہ دہلی میں بھی فلم کا شو زیادہ کامیاب نہیں رہا تھا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، فلم پر رش بڑھتا گیا۔ فلم کا ہر شو آمدنی کے اعتبار سے اس کے پچھلے شو سے بہتر ہوتا۔ آخر کار فلم سپرہٹ قرار پائی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ شرمیلا ٹیگور جو زیادہ بڑی اسٹار تھیں اور جن کے بارے میں ڈائریکٹر اور ڈسٹری بیوٹر وغیرہ یہ سمجھ رہے تھے کہ لوگ ان کی وجہ سے فلم دیکھنے آئیں گے، ان کے بجائے فلمی شائقین راجیش کھنہ کو زیادہ اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔

راجیش کھنہ نے بعد میں ایک انٹرویو میں بتایا "اس فلم کی ریلیز سے پہلے مجھے عام آدمی تو کیا، فلم انڈسٹری والے بھی نہیں پہچانتے تھے اور اگر پہچانتے بھی تھے تو کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا، کوئی میرے سلام کا جواب نہیں دیتا تھا لیکن اس فلم کی ریلیز کے بعد اسٹوڈیوز میں بھی میری عدم موجودگی میں لوگ میرے بارے میں پوچھنے لگے 'یار...... وہ نیا لڑکا آج کل کہاں ہے؟' مجھے یوں لگتا جیسے اس فلم کی وجہ سے چند دنوں میں میری زندگی میں کوئی انقلاب آگیا ہے، کوئی جادو ہوگیا ہے۔"

تین بڑے فلمی ہیروز کی مثلث بولی وڈ پر راج کر چکی تھی۔ دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند...... دلچسپ بات یہ تھی کہ فلمی شائقین کو راجیش کھنہ میں بیک وقت ان تینوں بڑے ہیروز کی جھلک نظر آتی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان میں چوتھے ہیرو شمی کپور کی جھلک بھی موجود تھی۔ وہ گویا چار سپر اسٹارز کا مجموعہ تھے، اس کے باوجود ان کا اپنا ایک انداز، ایک اسٹائل تھا جو سب سے الگ تھلگ تھا اور اس میں ایک کشش، نیاپن اور تازگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے راجیش کھنہ کا نام گھر گھر گونجنے لگا تھا اور یہ بات فلم ڈائریکٹرز کیلئے بھی حیرت انگیز تھی۔

ایک نہایت سینئر فلمی صحافی نے ایک مرتبہ لکھا "راجیش کھنہ پر پکچرائز ہونے والے گانے گلی کوچوں میں گائے جاتے تھے۔ میرا سالا اپنی بلڈنگ کی آٹھویں منزل پر بالکونی میں کھڑے ہوکر بہ آواز بلند گاتا تھا "میرے سپنوں کی رانی کب آئے گی تو......؟ اس کی محبوبہ سامنے والی بلڈنگ کی دوسری منزل پر، بالکونی میں یہ آواز سن کر خوش ہوتی تھی...... اور آخر کار دونوں کی شادی ہوگئی۔"

اسی طرح راجیش پر پکچرائز ہونے والا دوسرا گانا "روپ تیرا مستانہ......" بھی نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہوا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ راجیش کھنہ صرف نوجوانوں کے پسندیدہ ہیرو نہیں تھے بلکہ وہ ہر عمر کے مردوں اور عورتوں میں مقبول تھے۔ تاہم نقادوں کو ان کے بارے میں شک تھا کہ شاید ان کی یہ مقبولیت دیرپا ثابت نہیں ہوگی۔ انہوں نے کئی فلمی ہیروز کو دیکھا جو آندھی طوفان کی طرح آئے تھے لیکن پھر پے در پے چند فلمیں فلاپ ہونے کے بعد غائب ہوگئے تھے لیکن راجیش کھنہ کا معاملہ شاید اس اعتبار سے مختلف تھا کہ "ارادھنا" کی کامیابی سے پہلے ان کی چار فلمیں فلاپ ہوچکی تھیں۔

ابھی "ارادھنا" ممبئی کے سنیما "راکسی" میں ہاؤس فل جارہی تھی کہ اس کے مقابل دوسرے سنیما "اوپیرا ہاؤس" میں ان کی دوسری فلم "دو راستے" لگ گئی۔ وہ بھی ہاؤس فل جانے لگی۔ بہت سے فلمی شائقین تو ایسے بھی ہوتے جو ایک سنیما میں راجیش کھنہ کی ایک فلم دیکھ کر نکلتے اور سامنے والے سنیما میں دوسری فلم دیکھنے کیلئے جا بیٹھتے۔ یہ کہانی ان دنوں انڈیا کے کئی شہروں میں دہرائی جارہی تھی۔ "دو راستے" ہدایت کار راج کھوسلہ کی معاشرتی فلم تھی، جسے لکشمی کانت، پیارے لال کی موسیقی اور آنند بخشی کے گیتوں کے ساتھ ساتھ راجیش کھنہ کی موجودگی نے یادگار بنادیا۔ اس کے یہ گانے تو آج بھی ذوق و شوق سے سنے جاتے ہیں:

* بندیا چمکے گی......
* چھپ گئے سارے نظارے......
* مرے نصیب میں اے دوست......
* یہ ریشمی زلفیں، یہ شربتی آنکھیں......

اس فلم میں راجیش کھنہ کے مقابل ہیروئن ممتاز بھی بہت خوبصورت لگیں اور ان کے درمیان فلمی شائقین کو جو کیمسٹری نظر آئی، اس نے فلمی شائقین کو سحر زدہ کردیا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران حقیقی زندگی میں بھی راجیش کھنہ اور ممتاز گہرے دوست بن گئے، یکے بعد دیگرے...... بلکہ تقریباً ساتھ ساتھ دو فلموں کی کامیابی نے راجیش کھنہ کو مقبولیت کی حیرت انگیز بلندیوں پر پہنچا دیا۔ کسی اسٹار کی اس قسم کی طوفانی مقبولیت اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ 1969ء راجیش کھنہ کی زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی سال ایک اور نئے، ابھرتے ہوئے اداکار کی فلم "سات ہندوستانی" ریلیز ہوئی تھی جس کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر خواجہ احمد عباس تھے اور وہ ابھرتے ہوئے اداکار امیتابھ بچن تھے۔ گو کہ انہیں اس فلم میں اپنی اداکاری پر "بہترین نئے اداکار" کا سب سے بڑا سرکاری ایوارڈ "نیشنل فلم ایوارڈ" ملا، لیکن یہ فلم باکس آفس پر فلاپ ہوگئی تھی۔

جنوری 1970ء میں ایک سینئر فلمی صحافی نے اپنے رسالے کے سرورق پر راجیش کھنہ کی تصویر اس سرخی کے ساتھ لگائی "ایک سپر اسٹار کا جنم"

اس زمانے کے مشہور فلمی جریدے "اسٹار اینڈ اسٹائل" کی مشہور کالم نگار دیویانی چوبال نے اپنے کالم "فرینکلی اسپیکنگ" کے ذریعہ راجیش کھنہ کیلئے "سپر اسٹار" کی اصطلاح متعارف کرائی تھی۔ وہ ایک بہت باوقار فلمی صحافی تھیں اور انڈیا کے ممتاز سماجی حلقوں میں ان کی نشست و برخاست تھی۔ وہ راجیش کھنہ کی دوست انجو مہندرو کے توسط سے راجیش کھنہ سے متعارف ہوئی تھیں اور پھر خود بھی راجیش کی بہت اچھی دوست بن گئی تھیں۔

دیویانی کو اختصار سے فلمی دنیا میں "دیوی" کہا جاتا تھا۔ راجیش کھنہ نے بطور اداکار

لینا چنداورکر کے ساتھ

اور دیوی نے بطور صحافی ایک ہی وقت میں جدوجہد شروع کی تھی اور دونوں کو اپنے اپنے میدان میں کامیابی بھی ایک ہی وقت میں حاصل ہوئی تھی۔ ان کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب دونوں اپنے اپنے میدان میں بڑا نام بنا چکے تھے۔ دیوی نے راجیش کھنہ کا پہلا انٹرویو اسی بلڈنگ میں لیا تھا، جس کے ایک فلیٹ میں راجیش بچپن سے رہ رہے تھے۔ انٹرویو کیلئے چار تصویریں اسی بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں کھینچی گئی تھیں۔ دیوی کے قلم کو "زہر میں ڈوبا ہوا قلم" کہا جاتا تھا۔ وہ فلم انڈسٹری کے لوگوں کے بارے میں اکثر زہریلے انداز میں ہی لکھتی تھیں لیکن راجیش کھنہ کیلئے ان کی تحریروں میں ہمیشہ مٹھاس ہی رہی۔

راجیش کھنہ کے عروج کا دور شروع ہوچکا تھا۔ انہیں دھڑا دھڑ فلموں کی آفرز ہورہی تھیں۔ اس زمانے میں فلم ہی لوگوں کیلئے سب سے بڑی تفریح تھی اور فلموں میں ہر طرح کے تجربات ہورہے تھے۔ تفریحی عناصر کے ساتھ ساتھ فلموں میں اس زمانے کے خاص خاص معاشرتی مسائل کو بھی اجاگر کیا جاتا تھا۔ تین بڑے ہیروز دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند شہرت کے عروج پر پہنچ کر گویا وہیں رک گئے تھے۔ شمی کپور خاصے موٹے ہوچکے تھے۔ ایسے میں سنیما کے پردے پر راجیش کھنہ کا اضافہ تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تھا۔ نئی نسل کو تو خاص طور پر گویا ایسے ہی کسی ہیرو کا انتظار تھا۔

1970ء کے آغاز میں راجیش کھنہ کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں جو انہوں نے کافی پہلے سائن کی تھیں، ان میں سے ایک "ڈولی" تھی اور دوسری "بندھن"۔ راجیش کے ساتھ "ڈولی" میں ان کی ہیروئن ببیتا تھیں جو اس سے پہلے "راز" میں بھی ان کے ساتھ ہیروئن آئی تھیں۔ وہ ببیتا کی پہلی فلم تھی۔ "ڈولی" اوسط درجے کی فلم تھی لیکن چونکہ اس وقت راجیش کھنہ کی مقبولیت کا طوفان شروع ہوچکا تھا، اس لئے اس کمزور فلم نے بھی اچھا خاصا بزنس کرلیا۔

دوسری فلم "بندھن" کی کہانی نئے رائٹرز کی جوڑی سلیم، جاوید نے لکھی تھی اور یہ راجیش کی ایسی دوسری فلم تھی جس میں وہ ممتاز کے ساتھ ہیرو آرہے تھے، جبکہ اس میں راجیش کی حقیقی زندگی کی گرل فرینڈ انجو مہندرو بھی ایک ثانوی کردار میں موجود تھی، لیکن اس فلم کی شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے دونوں کے درمیان کچھ تلخی ہوچکی تھی جس کا اثر ان کے فلمی مناظر پر بھی پڑا۔ دونوں کے درمیان ایک نادیدہ خلیج کا احساس فلم کے ناظرین تک کو ہوگیا جبکہ ممتاز کے ساتھ حسب سابق راجیش کھنہ کی کیمسٹری مثالی رہی۔

انجو مہندرو سے راجیش کی دوستی تقریباً پانچ سال سے چلی آرہی تھی اور جب سے راجیش یکدم بہت زیادہ مشہور اور مقبول ہوئے تھے تو لڑکیوں میں ان کیلئے پسندیدگی کے جذبات دیوانگی کی حد تک جا پہنچے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ انجو مہندرو سے ملنے جاتے تھے اور پاس پڑوس کی لڑکیاں ان کی گاڑی انجو کے گھر کے سامنے کھڑی دیکھتی تھیں تو وہ راجیش کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے ان کے انتظار میں گاڑی کے گرد جمع ہوجاتی تھیں۔ انتظار کے دوران کچھ لڑکیاں ان کی گاڑی کو چومتی تھیں اور بعض لڑکیاں گاڑی پر لگی گرد کو انگلی سے سیندور کی طرح مانگ میں لگاتی تھیں۔ آئے دن انجو اور راجیش کی محبت کی کہانیاں بڑے بڑے فلمی رسالوں اور اخباروں میں چھپتی تھیں۔

فلمی اداکارہ کی حیثیت سے انجو کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی لیکن راجیش کی گرل فرینڈ کی حیثیت سے اسے میڈیا کی بہت زیادہ توجہ حاصل تھی۔ دوسری طرف وہ بے شمار لڑکیوں کو راجیش پر فدا ہوتے دیکھتی تھی۔ خود اپنے گھر کے سامنے وہ راجیش کے بارے میں لڑکیوں کی دیوانگی کے مظاہرے دیکھتی تھی۔ لڑکیاں نہ صرف راجیش کی گاڑی کو چومتی تھیں اور اس پر لگی ہوئی مٹی کو مانگ کا سیندور بناتی تھیں بلکہ انجو کے سامنے ہی راجیش کی طرف محبت نامے بھی اچھالتی تھیں۔ رنگ برنگے لفافے اور کاغذ راجیش کے قدموں میں آکر گرتے تھے لیکن انجو کے سامنے راجیش کھنہ انہیں اٹھاتے نہیں تھے۔ انجو نے راجیش کے کہنے پر ماڈلنگ بھی چھوڑ دی تھی جبکہ اسے ماڈلنگ سے خاصی آمدنی ہورہی تھی۔ فلموں میں وہ کوئی مقام نہیں بنا سکی۔ وہ بلاشبہ راجیش سے دلی محبت کرتی تھی لیکن راجیش کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور مصروفیت رفتہ رفتہ اس محبت کو کھا گئی۔

1970ء کے اختتام پر راجیش کھنہ کی دو فلمیں "خاموشی" اور "سفر" ریلیز ہوئیں۔ کاروباری طور پر یہ زیادہ کامیاب فلمیں نہیں تھیں۔ انہیں سائن کرتے وقت شاید راجیش کو خود بھی اندازہ تھا کہ یہ فلمیں زیادہ پیسہ نہیں کمائیں گی لیکن ان کے ذریعے انہوں نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ایک باصلاحیت اداکار بھی تھے۔ شاید وہ یہی چاہتے تھے کہ لوگ انہیں محض ایک روایتی فلمی ہیرو نہ سمجھیں بلکہ انہیں پتہ چل جائے کہ ان کے اندر ایک حقیقی فنکار، ایک اعلیٰ درجے کا اداکار بھی چھپا ہوا تھا۔ (جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

ان کی والدہ فلم میں انہیں مرتے دیکھ کر رونے پیٹنے لگیں

قسط نمبر 9

''خاموشی'' اور ''سفر'' جیسی سنجیدہ...... بلکہ کافی حد تک بوجھل اور المیہ فلمیں کرنے کے بعد راجیش کھنہ کو شاید قدرت کی طرف سے ان کا تاثر زائل کرنے کے لئے من موہن ڈیسائی کی ہلکی پھلکی اور مزاحیہ فلم ''سچا جھوٹا'' مل گئی۔ اس میں بھی راجیش کھنہ کا ڈبل رول تھا اور دونوں کردار ایک دوسرے کے متضاد تھے جن کی وجہ سے راجیش کو اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوانے کا ایک اور موقع ملا۔ ممتاز ایک بار پھر ان کی ہیروئن تھیں۔ اس فلم کی موسیقی بھی عمدہ تھی۔ اس کا ایک گانا تو آج بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر عموماً سنا جاتا ہے ''میری پیاری بہنیا بنے گی دلہنیا''

''سچا جھوٹا'' ایک سال کے عرصے میں راجیش کھنہ کی تیسری انتہائی کامیاب فلم تھی۔ اس پر انہیں پہلا فلم فیئر ایوارڈ ملا، حالانکہ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ فلم ''خاموشی'' میں ان کی اداکاری زیادہ اچھی تھی۔ بہرحال راجیش کھنہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے، ہر طرف ان کے چرچے تھے۔ عام طور پر برصغیر میں المیہ انجام کی فلمیں پسند نہیں کی جاتیں، اس لئے پاک و ہند میں اکثر فلموں کا انجام خوشگوار رکھا جاتا ہے لیکن راجیش کھنہ ایسے خوش قسمت اداکار تھے جن کی المیہ انجام کی فلمیں اور بھی زیادہ کامیاب ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے صرف دلیپ کمار کی فلموں ''دیوداس''، ''دیدار'' اور ''میلہ'' نے یہ مثال قائم کی تھی اور اسی بناء پر دلیپ صاحب کو ''ٹریجڈی کنگ'' کا خطاب ملا تھا۔

خود راجیش کھنہ کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ ان کی وہ فلمیں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں جن کے آخر میں وہ مر جاتے ہیں، اس طرح انہیں فلمی ناظرین کی زیادہ ہمدردیاں حاصل ہوتی ہیں لیکن ایک مسئلہ یہ تھا کہ ان کی والدہ انہیں فلم میں مرتے دیکھ کر اس طرح پریشان اور بدحواس ہو جاتی تھیں جیسے وہ سچ مچ مر گئے ہوں، حالانکہ وہ اس وقت اپنی والدہ کے قریب ہی بیٹھے ہوتے تھے۔ پہلی بار تو انہیں فلم میں مرتے دیکھ کر انہوں نے باقاعدہ رونا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔

1970ء راجیش کھنہ کے لئے کامیابیوں کا سال تھا۔ ان کی فلمیں اوپر تلے کامیاب ہو رہی تھیں۔ اکثر سینماؤں میں انہی کی فلم لگی نظر آتی۔ ''کٹی پتنگ''، ''دی ٹرین'' اور ''آن ملو سجنا'' میں ان کے رول بے حد پسند کئے گئے۔ ان کی فلمیں نہ صرف کاروباری طور پر بہت کامیاب ہو رہی تھیں بلکہ ان کے گانے بھی بے حد مقبول ہو رہے تھے۔ ''کٹی پتنگ'' میں راجیش کھنہ کے ساتھ موسیقار آر ڈی برمن اور گلوکار کشور کمار کی جو مثلث بنی تھی، وہ بے حد کامیاب رہی۔ ''یہ شام مستانی مدہوش کئے جائے......''، ''پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے......'' اور ''یہ جو محبت ہے یہ ان کا ہے کام'' اس قسم کے گانے گویا راجیش کھنہ کی پہچان بنتے جا رہے تھے۔

اسی زمانے میں فلم میکر ہریش کیش مکر جی نے اپنی فلم ''آنند'' کے لئے راجیش کھنہ سے رجوع کیا۔ انہوں نے اس فلم کے لئے پہلے کئی دوسرے اداکاروں کو ذہن میں رکھا تھا لیکن پھر ان کی نظر راجیش کھنہ پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہریش کیش مکر جی نظم و ضبط کے بڑے پابند اور بااصول قسم کے فلم میکر تھے۔ وہ ''آنند'' کو بہت کم وقت میں مکمل کرنا چاہتے تھے اور راجیش کھنہ کی یہ حالت تھی کہ انہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ مشین کی طرح دن رات کام کر رہے تھے۔ ان کے پاس ''آنند'' کا اسکرپٹ پڑھنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ وہ اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے روز بہ روز چڑچڑے ہوتے جا رہے تھے۔

اس کے باوجود ہریش کیش مکر جی نے کسی طرح راجیش کھنہ کو فلم سائن کرنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ بعد میں ایک انٹرویو میں خود راجیش کھنہ نے بتایا ''یہ بات شاید کسی کو معلوم نہیں کہ 'آنند' میں نے اپنی زندگی کے مصروف ترین دور میں مکمل کرائی۔ کام کے دباؤ سے میں پاگل ہوا جا رہا تھا اور لوگوں کو یہ بتا بتا کر میرا گلا بیٹھ گیا تھا کہ میرے پاس ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ہے لیکن کوئی میری بات سنتا ہی نہیں تھا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ کسی نہ کسی طرح مجھ سے فلم سائن کرا لیتے تھے جبکہ میرے پاس شوٹنگ کے لئے ڈیٹس ہی نہیں تھیں۔ پھر مجھ پر یہ تنقید بھی ہوتی تھی کہ میں نے اپنی بساط سے زیادہ کام اپنے اوپر لاد لیا ہے۔ میری زندگی میں کوئی نظم و ضبط نہیں ہے اور میں لالچی ہو گیا ہوں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی بات درست نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ مجھے اپنے جاننے والوں کے سامنے صحیح طریقے سے 'ناں' کہنا نہیں آتا تھا۔ حقیقت میں ایک اسٹار کی اصل آزمائش کامیابی کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔''

کام کے بوجھ سے جب فلم اسٹارز کے اعصاب چٹخنے لگتے ہیں تو عام طور پر وہ شراب کا سہارا لیتے ہیں، نشے کی آغوش میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ راجیش کھنہ نے بھی یہی کیا۔ روزانہ شام کو ان کے ہاں دوستوں کی محفلیں جمنے لگیں، پینے پلانے کا دور چلتا، ہنسی مذاق ہوتا اور رات بھر کے لئے گویا ہر پریشانی راجیش کھنہ کا پیچھا چھوڑ دیتی اور صبح تازہ دم ہو کر وہ ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ کام پر پہنچ جاتے۔ فلم انڈسٹری کے خاص خاص لوگ راجیش کی محفلوں میں شریک ہوتے جہاں بہترین شرابوں اور بہترین کھانوں سے ان کی تواضع کی جاتی۔

راجیش بہ ذات خود میزبانی کے فرائض انجام دیتے اور پورا خیال رکھتے کہ کسی کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران جب راجیش اعلیٰ درجے کے کسی ہوٹل میں مقیم ہوتے تو ان کے سوئٹ میں بھی ہر شام اس طرح کی محفل ضرور جمتی۔ ایک سینئر صحافی بھارتی پردھان نے ایسی ہی ایک محفل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''میں اس محفل میں کھانے کے دوران کسی سے باتوں میں منہمک تھا، مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں بہت دیر تک باتوں میں محو رہا اور اس دوران جس روٹی سے نوالا توڑتا رہا وہ مسلسل گرم ہی رہی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ جیسے ہی میں دو تین نوالے توڑ لیتا تھا، راجیش کھنہ خود میری پلیٹ میں سے وہ روٹی اٹھا کر اس کی جگہ گرم روٹی رکھ دیتے تھے۔ وہ ایسے میزبان تھے کہ خود تو ٹھنڈی روٹی بھی کھا لیتے تھے لیکن اپنے مہمان کی پلیٹ میں ٹھنڈی روٹی نہیں رہنے دیتے تھے۔''

راجیش رفتہ رفتہ ان محفلوں کے کچھ زیادہ ہی عادی ہوتے چلے گئے۔ رات گئے تک محفل جمتی اور ان محفلوں کی وجہ سے وہ روزانہ شوٹنگ پر تاخیر سے پہنچتے۔ فلم ڈائریکٹر ہریش کیش مکر جی نے ایک مرتبہ راجیش کھنہ سے پوچھا ''کاکا! تمہیں یاد ہے، آخری مرتبہ تم نے سورج طلوع ہوتے کب دیکھا تھا؟''

راجیش نے کچھ دیر سوچا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں...... مجھے یاد نہیں۔''

تب ہریش کیش مکر جی نے دوسرا سوال کیا ''اور کیا تمہیں یاد ہے کہ آخری مرتبہ تم نے سورج غروب ہوتے کب دیکھا تھا؟''

راجیش کھنہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ ظاہر ہے اس سوال کا جواب بھی نفی میں تھا۔

اپنے ایوارڈز کے ساتھ
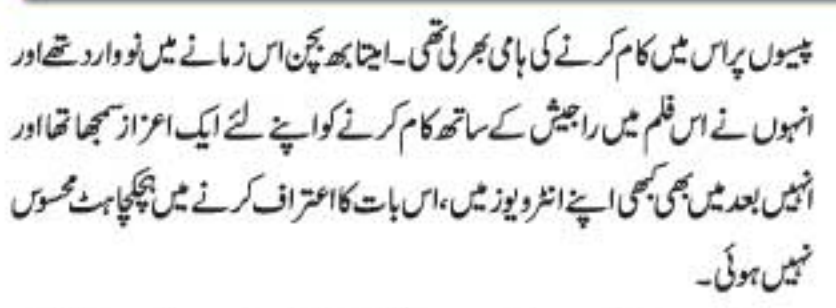
ممتاز کے ساتھ ''سچا جھوٹا'' میں

راجیش کھنہ، مکر جی کی بہت عزت کرتے تھے اور بعض اوقات ان کا سخت لہجہ بھی برداشت کر لیتے تھے۔ مکر جی ایک بہترین ڈائریکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت جہاندیدہ آدمی تھے۔ زندگی کے بیشتر معاملات کا انہیں بڑا تجربہ تھا اور وہ جو بھی بات کرتے تھے، بڑی سمجھداری سے کرتے تھے۔ راجیش کھنہ نے ان کی فلم ''آنند'' کا اسکرپٹ پڑھ کر اپنے اس زمانے کے مروجہ معاوضے سے خاصے کم پیسوں پر اس میں کام کرنے کی ہامی بھر لی تھی۔ امیتابھ بچن اس زمانے میں نووارد تھے اور انہوں نے اس فلم میں راجیش کے ساتھ کام کرنے کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھا تھا اور انہیں بعد میں بھی کبھی اپنے انٹرویوز میں، اس بات کا اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

مکر جی نے یہ فلم صرف ایک ماہ میں مکمل کر لی تھی جبکہ ان دنوں راجیش کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک سے دوسری، اور دوسری سے تیسری فلم کے سیٹ کے درمیان چکرا رہے ہوتے تھے۔ انہیں کچھ یاد نہیں ہوتا تھا کہ کس فلم میں ان کا کون سا گانا ہے اور کس فلم میں کون سا مکالمہ ہے۔ ظاہر ہے ''آنند'' کے سیٹ پر بھی وہ لیٹ پہنچتے تھے۔ مکر جی سوچتے تھے کہ راجیش اپنا سین مکمل کر لے، بعد میں اسے ڈانٹوں گا لیکن راجیش کی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس کی پرفارمنس اتنی عمدہ ہوتی کہ شوٹنگ مکمل ہونے کے بعد مکر جی کہتے ''کاکا! مجھے تم پر اتنا غصہ تھا کہ آج میں نے تمہاری خوب خبر لینی تھی...... لیکن تم نے کام اتنا اچھا کیا ہے کہ اب تو تمہیں سات خون بھی معاف کرنے پڑیں گے۔''

1970ء کے اختتام تک بولی وڈ میں راجیش کھنہ کی اہمیت اور عوام میں ان کی مقبولیت بہت بڑھ چکی تھی۔ صرف دھرمیندر ایک ایسے ہیرو تھے جو راجیش کھنہ کی مقبولیت سے متاثر نہیں ہوئے تھے ورنہ راجیش کھنہ کی آمد کے بعد کئی ہیروز کی شہرت اور مقبولیت کے چراغ ٹمٹمانے لگے تھے جن میں راجندر کمار، منوج کمار اور شمی کپور جیسے اسٹارز شامل تھے۔ دلیپ، دیو آنند اور راج کپور کی مثلث برقرار تھی لیکن یہ تینوں گویا بڑھتی عمر کے فلمی شائقین کے ہیرو تھے۔ یہ نسل بدستور ان تینوں سپر اسٹارز کے ساتھ اپنی وابستگی، محبت اور پسندیدگی بڑی ثابت قدمی سے برقرار رکھے ہوئے تھی لیکن انہیں اب نئی نسل کے ہیروز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

راجیش کھنہ کی خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ انہیں مسلسل، نہایت باصلاحیت فلم ڈائریکٹرز، میوزک ڈائریکٹرز، شاعروں اور مصنفوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا جو اپنے کام میں بڑا نام اور مقام رکھتے تھے۔ ان سب لوگوں کی صلاحیتیں بھی اس زمانے میں عروج پر تھیں۔ اس زمانے کے بیشتر مقبول اور مشہور فلمی گانے راج کھنہ پر پکچرائز ہوئے جنہوں نے ان کی مقبولیت بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

جاوید اختر جو اس زمانے میں سلمان کے والد سلیم خان کے ساتھ مل کر فلمی کہانیاں لکھتے تھے، انہوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا ''1969ء سے 1972ء تک کے عرصے میں فلم کے میدان میں گویا صرف ایک ہی گھوڑا دوڑ رہا تھا جس پر سب پیسہ لگا رہے تھے اور وہ تھا راجیش کھنہ!''

اسی زمانے کی بات کرتے ہوئے سلیم خان کہتے ہیں ''شاہ رخ اور سلمان خان، راجیش کھنہ کے بعد سامنے آئے اور بلاشبہ ان دونوں کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی لیکن راجیش کھنہ جیسی مقبولیت کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اس مقبولیت کی کوئی مثال نہ تو راجیش کھنہ سے پہلے ملتی ہے اور نہ ہی ان کے بعد۔''

☆......☆......☆

باندرہ، ممبئی کا ایک نہایت مہنگا اور پوش، ساحلی علاقہ ہے۔ بہت سے فلم اسٹارز اور بڑے بزنس مین یہاں رہتے ہیں۔ اب تو یہ کثیر المنزلہ عمارتوں کی وجہ سے کافی گنجان لگنے لگا ہے اور یہاں کافی بھیڑ بھاڑ نظر آتی ہے لیکن پچیس تیس سال پہلے تک یہاں زیادہ تر بنگلے ہی تھے اور یہاں اتنی بھیڑ بھاڑ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بہرحال اب بھی یہاں بلند و بالا عمارتوں اور جدید بنگلوں کے درمیان کہیں کہیں کوئی پرانا اور کہنہ سال بنگلا بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ 1960ء کی دہائی میں عین ساحل کے سامنے، کارٹر روڈ پر واقع ایک بنگلا ''آشیانہ'' لوگوں کے لئے کافی جانا پہچانا اور مشہور تھا۔

یہ مشہور موسیقار نوشاد کا بنگلا تھا۔ اسی سے متصل ایک اور، دو منزلہ بنگلا تھا جو اس زمانے میں بھی خاصا پرانا اور قدرے خستہ حال دکھائی دیتا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگ اسے ''بھوت بنگلا'' کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ بنگلا کافی عرصے سے ''برائے فروخت'' تھا لیکن قیمت نہایت کم ہونے کے باوجود اس کا کوئی خریدار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ راجندر کمار کی اس بنگلے پر نظر پڑی تو نہ جانے کیوں انہیں وہ بہت پسند آ گیا۔ وہ دوڑے دوڑے فلمساز بی آر چوپڑا کے پاس گئے۔ وہ چوپڑا کی فلم ''قانون'' سائن کرنے سے انکار کر چکے تھے کیونکہ اس فلم میں کوئی گانا نہیں تھا، لیکن اب انہوں نے بی آر چوپڑا سے کہا کہ وہ نہ صرف ان کی فلم ''قانون'' میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں بلکہ دو اور فلموں میں بھی کام کریں گے، بشرطیکہ وہ انہیں معاوضہ ایڈوانس دے دیں۔

(جاری ہے)

انہوں نے بہت سے لوگوں کو دکھایا

تمکین تبسم

شبانہ اعظمی کے ساتھ

ڈمپل کپاڈیا، راجیش کھنہ

قسط نمبر 10

بی۔آر چوپڑا نے فوراً راجندر کمار کو 90/ ہزار روپے نقد دے دیئے، راجندر کمار کو وہ بنگلا اس زمانے میں صرف 60/ ہزار روپے میں مل گیا۔ ایک تو اس زمانے میں اچھے بھلے بنگلوں کی قیمتیں لگ بھگ اتنی ہی ہوتی تھیں لیکن وہ بنگلا تو چونکہ "بھوت بنگلا" کے نام سے مشہور تھا اس لئے راجندر کمار کو اور بھی سستا مل گیا۔ وہ فوراً ہی اس میں شفٹ بھی ہوگئے۔ انہوں نے اس بنگلے کا نام "ڈمپل" رکھا جو ان کی بیٹی کا نام تھا۔

لوگ اس گھر کو منحوس کہتے تھے لیکن راجندر کمار اس گھر میں شفٹ ہوئے تو ان کی قسمت ہی بدل گئی۔ انہوں نے اپنی زندگی اور اپنے کیریئر کا بہترین دور اسی گھر میں رہتے ہوئے دیکھا۔ اس گھر میں رہتے ہوئے انہوں نے جتنی فلموں میں کام کیا، انہوں نے کوئی نہ کوئی "جوبلی" ضرور کی جس کی وجہ سے راجندر کمار کی عرفیت ہی "جوبلی کمار" ہوگئی۔ پھر ایک وقت آیا کہ راجندر کمار نے پالی ہل پر ایک اور بنگلا لے لیا۔ انہوں نے وہاں منتقل ہونے کا ارادہ کرلیا اور یہ بنگلا جو کبھی "بھوت بنگلا" کہلاتا تھا، ایک بار پھر "برائے فروخت" ہوگیا۔ اب وہ اپنے نئے مالک کا منتظر تھا اور تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کی تیاری کر رہی تھی۔

راجیش کھنہ کا خواب تھا کہ ان کا گھر سمندر کے کنارے ہو اور اس کا رخ سمندر کی طرف ہو۔ انہیں پتا چلا کہ راجندر کمار اپنا گھر بیچ رہے ہیں تو وہ بے چین ہوگئے لیکن اس وقت راجندر کمار جو قیمت مانگ رہے تھے، اتنی رقم راجیش کھنہ کے پاس نہیں تھی۔ اسی زمانے میں چنپا دیور نامی ایک پروڈیوسر مدراس سے ممبئی آئے۔ وہ ایک اردو فلم بنانا چاہتے تھے اور ایک نام نہاد سی کہانی بھی ان کے پاس تھی جو نہ جانے ان کی اپنی تھی یا وہ کہیں سے اٹھا کر لائے تھے۔ کہانی ایک شخص کی تھی جس نے ہاتھی پال رکھے تھے۔

اس موضوع پر پہلے تامل زبان میں ایک فلم بن چکی تھی۔ چنپا دیور یہ کہانی لے کر کسی نہ کسی طرح راجیش کھنہ کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے راجیش کھنہ کو اس فلم میں کام کرنے کے لئے بھاری معاوضے کی پیشکش کردی جو ان کے مروجہ معاوضے سے کہیں زیادہ تھا۔ فلم کی کہانی خواہ بے سروپا تھی لیکن معاوضے کی رقم سن کر راجیش کھنہ کے منہ میں پانی آگیا خاص طور پر اس لئے کہ وہ ان دنوں راجندر کمار کا بنگلا خریدنے کے شدید خواہش مند تھے۔ انہوں نے کنٹریکٹ سائن کرلیا اور سائن کرتے وقت انہوں نے پانچ لاکھ روپے وصول کرلئے۔ اس وقت تک پوری فلم انڈسٹری میں کسی نے کنٹریکٹ سائن کرتے وقت پانچ لاکھ روپے وصول نہیں کئے تھے، پوری انڈسٹری میں اس بات کی دھوم مچ گئی۔

اس وقت فلم انڈسٹری میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے زندگی میں کبھی یکمشت پانچ لاکھ روپے نقد نہیں دیکھے تھے۔ اداکار دھیرج کمار جو ان دنوں فیمس اسٹوڈیو میں راجیش کھنہ کے ساتھ فلم "تیاگ" کی شوٹنگ کر رہے تھے، انہوں نے ایک بار ایک صحافی کو ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا "ایک روز کاکا (راجیش کھنہ) نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور ایک سوٹ کیس کھولنے کی ہدایت کی۔ میں نے سوٹ کیس کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ نئے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے راجیش کھنہ کی طرف دیکھا تو انہوں نے گویا میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ صرف میں ہی وہ آدمی نہیں تھا جسے انہوں نے یہ رقم دکھائی بلکہ وہ، نوٹوں سے بھرا ہوا وہ چھوٹا سا سوٹ کیس کئی دن تک اسٹوڈیوز میں اٹھائے پھرتے رہے۔ اپنے بہت سے جاننے والوں کو انہوں نے پانچ لاکھ کی رقم کا "دیدار" کرایا۔ ان کے خیال میں یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ تھوڑی بہت شیخی بگھارنا ان کا حق بنتا تھا۔"

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جب انہیں ذرا وقت میسر آیا اور انہوں نے تھوڑی توجہ سے فلم کا اسکرپٹ پڑھا تو ان کا دل ڈوب گیا۔ کہانی کا کوئی سر پیر نہیں تھا اور جس کردار میں انہیں کاسٹ کیا جارہا تھا، وہ بھی فضول تھا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اس اسکرپٹ پر بننے والی فلم فلاپ ہوگی۔ اس وقت انہیں رائٹرز کی جوڑی سلیم جاوید کی یاد آئی جنہوں نے ان کے لئے جی پی سپی کی فلم "انداز" میں بہت اچھا رول لکھا تھا جو بے حد پسند کیا گیا تھا۔

سلیم خان اس سلسلے میں، اپنی یادوں کا خزانہ کھنگالتے ہوئے کہتے ہیں "راجیش کھنہ نے مجھے فون کیا اور اعتراف کیا کہ اس نے زیادہ معاوضے کے لالچ میں، اسکرپٹ پر توجہ دیئے بغیر کنٹریکٹ سائن کردیا۔ کل معاوضہ غالباً نو لاکھ روپے طے ہوا تھا جن میں سے پانچ لاکھ راجیش کو کنٹریکٹ سائن کرتے وقت ہی مل گئے تھے۔ اسے مکان اور نئی کار خریدنے کے لئے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس وقت راجیش ایک فلم کا کل پانچ لاکھ معاوضہ لے رہے تھے یعنی یہ فلم انہوں نے اپنی مارکیٹ ویلیو سے تقریباً دگنے معاوضے میں سائن کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے اور جاوید اختر سے منت کے سے انداز میں کہا کہ ہم کسی بھی طرح اس اسکرپٹ کو ڈھنگ کا بنادیں۔ پروڈیوسر سے وہ خود ہی نمٹ لیں گے۔ چنانچہ ہم نے اسکرپٹ کو نئے سرے سے لکھا اور یوں راجیش کھنہ کی مشہور اور کامیاب فلم "ہاتھی میرے ساتھی" وجود میں آئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کئی سال بعد اس اردو فلم کو دوبارہ تامل زبان میں بنایا گیا۔"

اپنی کامیابیوں کے صرف ایک سال کے اندر اندر راجیش کھنہ نے اپنے تمام بڑے خوابوں کی تعبیر حاصل کرلی۔ وہ بے پناہ مشہور و مقبول ہوگئے۔ انہوں نے اپنے خوابوں کے عین مطابق ایک ایسا بنگلا خرید لیا جس کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ نئی، من پسند کار بھی انہوں نے لے لی۔ ان کے والد نے ان کے گھر کا نام "آشیرواد" تجویز کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس نام کے اثر سے اس گھر کو، اور اس میں رہنے والوں کو کسی کی نظر نہیں لگے گی۔ راجیش کھنہ اپنے والدین کے ساتھ اس گھر میں منتقل ہوئے تو پہلے کافی پوجا پاٹ وغیرہ ہوئی، اس کے بعد ایک زوردار "ہاؤس وارمنگ" پارٹی دی گئی جس کے دوران راجیش نے اپنے ایک قریبی دوست اور پروڈیوسر ڈائریکٹر سے کہا "آج میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔ یہ ہے میرے خوابوں کا گھر......اور یہ سب میری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

اس گھر کی دیواریں کافی اونچی تھیں اور ان کے اندر کی اکثر خبریں صرف خاتون صحافی دیویانی چوبال عرف دیوی کے ذریعے باہر آتی تھیں اور فلمی اخباروں، رسالوں میں ہلکے پھلکے اسکینڈلز یا گپ شپ کے انداز میں چھپتی تھیں۔ باہر کے لوگوں میں صرف دیوی ہی ایک ایسی شخصیت تھی جسے کسی سے پوچھے یا اجازت لئے بغیر اور اپنی آمد کی اطلاع دیئے بغیر سیدھا اندر جانے کی آزادی تھی۔ ہر ہفتے اس کے کالم میں کسی نہ کسی انداز میں راجیش کھنہ کا تذکرہ ضرور ہوتا تھا۔ اس کے اور راجیش کھنہ کے تعلق کے بارے میں بھی فلم انڈسٹری میں چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔

ایک بار کچھ ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ ایک صحافی نے دیوی سے پوچھ ہی لیا "کیا تمہارا راجیش سے معاشقہ چل رہا ہے؟"

اس پر دیوی نے قہقہہ لگایا اور بولی "وہ میرا بچہ ہے۔ میں اس کے لئے ماں کی طرح ہوں۔"

اسی روز اس صحافی نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک جگہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران کھانے کا وقفہ ہوا تو راجیش کھنہ نے ہاتھ سے دال چاول کھائے اور بعد میں اپنے ہاتھ دھونے کے بجائے اطمینان سے دیوی کی ساڑھی کے پلو سے پونچھ لئے اور دیوی کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ صرف ہاتھ ہی نہیں، راجیش نے اپنا منہ بھی دیوی کی ساڑھی سے ہی پونچھا۔ جب راجیش ذرا دور چلا گیا تو دیوی نے اس صحافی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھ لیا تم نے؟ یہ رشتہ ہے میرا اور راجیش کا......!"

نئے مکان میں راجیش کھنہ بعض اوقات اوپر ٹیرس پر کھڑے نظر آتے۔ وہ دیر تک کھوئی کھوئی نظروں سے سمندر کی طرف دیکھتے رہتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سمندر کی سرکش لہریں اور ان کا شور راجیش کو سحر زدہ کردیتا تھا۔ اس دوران شاید انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ نیچے ڈرائنگ روم میں بہت سے صحافی، پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ان سے ملاقات کے منتظر بیٹھے ہیں۔ کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اوپر جاکر انہیں بلا لائے یا ان کے نظارے میں خلل ڈالے۔ البتہ راہ چلتے لوگ اپنے محبوب اسٹار کو دیکھ کر رک جاتے اور کچھ دیر میں اچھا خاصا مجمع لگ جاتا۔ اس وقت بالکل ایسا لگتا جیسے راجیش کھنہ بادشاہ سلامت ہوں اور اپنی رعایا کے پُرزور اصرار پر انہیں "درشن" دینے اپنے محل کے ٹیرس پر آئے ہوں۔ کبھی کبھی تو راجیش کھنہ اپنے گردوپیش سے بے نیاز، وہیں کھڑے کھڑے، کھوئی کھوئی نظروں سے سمندر کی طرف دیکھتے دیکھتے کئی گھنٹے گزار دیتے۔ کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہے ہوتے تھے، کن خیالوں میں کھوئے ہوتے تھے۔

راجیش کھنہ کو بہت کم عرصے میں بہت زیادہ کامیابی نصیب ہوگئی تھی اور کامیابی کا اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے۔ یہ تمام شرابوں کے نشے سے الگ ہوتا ہے اور کامیابی کے ساتھ عموماً دولت بھی آتی ہے، دولت کا بھی اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ یوں راجیش کھنہ گویا دو آتشہ نشے کے اثر میں آگئے تھے۔ وہ جہاں جاتے، پرستاروں کا جم غفیر ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے امنڈ آتا۔ روزانہ کتنے ہی پروڈیوسر بریف کیس میں نقد رقم لئے ان کے گھر کے چکر لگاتے۔ ان کے مکان "آشیرواد" کی، اخباروں اور رسالوں میں اتنی تصویریں چھپیں اور اتنے تذکرے ہوئے کہ وہ بھی ممبئی کی ایک "ٹورسٹ اٹریکشن" کے طور پر مشہور ہوگیا۔ یعنی اگر کوئی کسی دوسرے شہر سے ممبئی آتا تھا تو اس شہر کے دوسرے مشہور اور قابل دید مقامات کے ساتھ راجیش کھنہ کے مکان کا دیدار کرنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر راجیش کھنہ کا بھی دیدار ہوجاتا تو اسے وہ اپنی بہت ہی بڑی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔

روزانہ اس گھر کے پتے پر پرستاروں کے ہزاروں خطوط موصول ہوتے۔ لکھنے والے صرف اتنا پتا لکھتے "راجیش کھنہ، آشیرواد، ممبئی" اور خط راجیش تک پہنچ جاتا۔ ان میں لڑکیوں کے خطوط زیادہ ہوتے جو راجیش کھنہ سے والہانہ اظہار عشق کرتیں۔ اس کی منتیں کرتیں کہ وہ ان سے شادی کرلے۔ یہ تو بتایا ہی جاچکا ہے کہ ان میں سے بعض خطوط لڑکیاں اپنے خون سے لکھتی تھیں۔ بعض اوقات تو راجیش کھنہ اپنے سیکرٹری کے سامنے میز پر خطوط کا انبار دیکھ کر خود بھی حیران پریشان ہوجاتے اور پنجابی میں جو کچھ کہتے اس کا مفہوم یہ ہوتا "یا اللہ! میں کیا کروں...... کہاں جاؤں...... اکیلی جان اور اتنے چاہنے والے......! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اتنا مشہور ہوجاؤں گا اور لوگ مجھے اس طرح چاہنے لگیں گے......!"

بہرحال راجیش کے سیکرٹری پرشانت کمار رائے جو راجیش کو تھیٹر کے زمانے سے جانتے تھے، تمام خطوط کے جواب میں راجیش کی ایک تصویر بھجوادیتے جس پر راجیش کے آٹوگراف ہوتے۔ راجیش جس طرح ہر عمر کی عورتوں، مردوں، حتیٰ کہ بچوں میں بھی مقبول تھے، اس کی مثال نہ تو ان سے پہلے کبھی دیکھنے میں آئی تھی اور نہ ہی ان کے بعد کبھی دیکھنے میں آئی۔

بھارت کے طول و عرض میں بکھری ہوئی نہ جانے کتنی لڑکیاں راجیش کھنہ کے لئے نہ جانے کیا کچھ کرنے پر تیار تھیں لیکن ان کی دوستی ابھی تک صرف انجو مہندرو ہی سے تھی۔ "آشیرواد" کی تزئین و آرائش بھی اسی نے کی تھی اور اس کا زیادہ وقت اسی گھر میں گزرتا تھا۔ وہ کافی حد تک گویا راجیش کھنہ کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں......اور یہ اس زمانے کے لحاظ سے بڑی آزاد خیالی کی بات تھی۔ انجو مہندرو کو، اس کے دور کی مناسبت سے ایک بے حد بولڈ لڑکی کہا جاسکتا ہے۔ (جاری ہے)

Bawarchi | AVTAAR | BABU | AAKHIR KYON ? | Nasihat

تمکین تبسم

قسط:11

راجیش کھنہ کے تمام ملازمین انجو مہندرو کو "میم صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ انجو راجیش کے گھر میں جتنا بھی وقت گزارتی تھیں، اس دوران تمام معاملات میں ان کا انداز گھر کی مالکن کا سا ہوتا تھا۔ گھر میں منعقد ہونے والی پارٹیوں اور تقریبات وغیرہ کا اہتمام بھی وہی کرتی تھیں۔ راجیش کی والدہ گو کہ انجو کی آزاد خیالی اور ان کے مغربی انداز و اطوار کی وجہ سے انہیں پسند نہیں کرتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ ہر اس چیز سے خوش رہتی تھیں جس سے ان کا بیٹا خوش رہتا تھا۔

گھر کے تمام ملازمین کا خیال تھا کہ ان کے صاحب جب بھی شادی کریں گے، انجو سے ہی کریں گے اور اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں گھر کی مالکن بن جائیں گی۔ حالانکہ انجو اور راجیش کے مزاج میں خاصا تضاد تھا۔ انجو مغرب زدہ اور آزاد خیال تھیں، جبکہ راجیش کا امیج فلم کے پردے پر خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک روایت پسند پنجابی فیملی کے فرد تھے اور بے پناہ مشہور و مقبول ہیرو بن جانے کے بعد بھی اندر سے کافی شرمیلے تھے لیکن مزاج کے اس تضاد کے باوجود راجیش اور انجو کی دوستی خوب نبھ رہی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے، شاید وہ درست ہی ہے۔ محبت کسی بھی فرق کو نہیں دیکھتی، مزاجوں کے فرق کو بھی نہیں دیکھتی۔

یہ بھی شاید قسمت کا کھیل تھا کہ راجیش کھنہ تو بہت تیزی سے اپنے کیریئر کی بلندیوں کی طرف جا رہے تھے لیکن انجو جن کامیابیوں کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں، ان میں سے کوئی بھی ان کے نصیب میں نہیں آسکی تھی۔ اس چیز نے رفتہ رفتہ ان کے درمیان خلیج حائل کرنا شروع کی۔ راجیش کا نظریہ تھا کہ انجو کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ کھاتے پیتے گھرانے کی فرد تھیں اور اگر ان کی شادی راجیش کھنہ سے ہو جاتی تو وہ ان کی ہر ذمہ داری آسانی سے اٹھا سکتے تھے لیکن انجو اس بات سے مطمئن نہیں تھیں۔ ان کی نظر میں ان کا اپنا کیریئر بھی بہت اہم تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ وہ بھی اپنی جگہ عملی زندگی میں کامیاب ہوں۔ راجیش کو احساس ہوا کہ انجو مکمل طور پر ان کی مرضی کے مطابق چلنے اور صرف ان پر انحصار کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ یہ چیز رفتہ رفتہ انہیں ایک دوسرے سے دور لے جانے لگی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نظریات کے اس اختلاف کی وجہ سے ان کے درمیان جھگڑے اور تلخیاں اس وقت سے ہی شروع ہو گئی تھیں جب راجیش کھنہ کو زیادہ کامیابیاں نصیب بھی نہیں ہوئی تھیں۔ ایسے ہی ایک جھگڑے کے بعد انجو مہندرو نے راجیش کھنہ کو چھوڑ کر مشہور زمانہ کرکٹر گیری سوبرسے مراسم بڑھا لئے تھے۔ اس زمانے میں ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم کو دنیا میں بہترین سمجھا جاتا تھا اور گیری سوبرز اس کے اسٹار کرکٹر تھے۔ گیری اور انجو اس زمانے میں اکثر پارٹیوں اور اسٹیڈیم میں اکٹھے دیکھے جانے لگے۔

ابھی شاید انجو کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھیں کہ گیری سوبرز سے ان کے تعلقات کا انجام کیا ہوگا کہ اس دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا جس کی انجو کو بھی توقع نہیں تھی۔ کلکتہ میں ایک پارٹی کے دوران گیری سوبرز، انجو کے لئے باقاعدہ منگنی کی انگوٹھی لے کر آگئے اور انہیں شادی کی پیشکش کر دی۔ انجو نے یہ پیشکش قبول بھی کر لی لیکن یہ خبر جب راجیش کھنہ تک پہنچی تو وہ صدمے اور غصے سے گویا پاگل ہو گئے۔ جب انجو واپس ممبئی پہنچیں تو ان کے اور انجو کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا لیکن اس جھگڑے کے نتائج مثبت نکلے۔ شاید اس موقع پر راجیش کو احساس ہوا کہ وہ انجو کے بغیر نہیں رہ سکتے اور انجو کو پتا چلا کہ راجیش ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ شاید انجو کو اس محبت کی قدر بھی ہو گئی۔ انہوں نے راجیش سے معذرت کر لی اور گیری سوبرز کو ان کی منگنی کی انگوٹھی واپس بھجوا دی۔

اس واقعے کے بعد دونوں کے باہمی تعلق میں بہتری آئی لیکن جب راجیش کھنہ کے عروج کا زمانہ شروع ہوا تو وہ انجو کے بارے میں بہت زیادہ "ملکیت پسند" سے ہو گئے۔ یوں لگتا جیسے وہ خود کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ انجو صرف اور صرف ان کی ہے۔ وہ چاہتے کہ انجو ہر وقت ان کے ساتھ رہے اور جب انجو ادھر ادھر ہوتی تو وہ ان کے بارے میں مکمل طور پر باخبر رہنے کی کوشش کرتے۔ انجو اس وقت کہاں ہے، کس کے ساتھ ہے، کیا کر رہی ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب حاصل کرنا ان کے لئے گویا ضروری ہوتا۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنا کوئی "جاسوس" بھی انجو کے پیچھے لگائے رکھتے۔ وہ جب شوٹنگ میں مصروف ہوتے تو ان کی خواہش ہوتی کہ وہ خواہ کتنی ہی دیر تک مصروف رہیں لیکن انجو ان کا انتظار کریں۔ حتیٰ کہ جب انجو گھر پہ ہوتیں تب بھی راجیش بار بار فون کر کے یہی تصدیق کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ واقعی گھر پر ہیں اور یہ بھی جاننے کی کوشش کرتے کہ وہ کیا کر رہی ہیں؟

راجیش کے اس زمانے کے جاننے والے بتاتے ہیں کہ راجیش، انجو سے تعلق کے بارے میں واقعی حد سے زیادہ جذباتی، ابنارمل اور ملکیت پسند تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نفسیاتی طور پر وہ عدم تحفظ کا شکار تھے۔ انہیں نوجوانی میں ہی عزت، دولت، شہرت، محبت، سب کچھ مل گیا تھا۔ شاید انہیں دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ ان میں سے کوئی چیز ان سے چھن نہ جائے۔ زندگی کے بہت سے معاملات میں بہر حال ان کا رویہ نارمل لوگوں والا نہیں ہوتا تھا۔ انہیں سنبھالنا واقعی بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اوپر سے، سپر اسٹار بننے کے بعد گویا ان کی زندگی کا کوئی پہلو نجی نہیں رہا تھا۔ ان کی زندگی کے بارے میں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات فوراً اخبارات اور رسائل کی زینت بن جاتی۔

اسی زمانے میں ان کی، رات کو پینے پلانے کی محفلیں بلاناغہ جمنے لگیں۔ ان محفلوں کا ماحول کچھ اس قسم کا ہوتا کہ رفتہ رفتہ راجیش کھنہ کے سچے دوست اور اصل ہمدرد ان سے دور ہونے لگے اور خوشامدی ان کی جگہ لینے لگے۔ راجیش ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ زیادہ خوشامد پسند ہوتے جا رہے تھے، وہ اپنے خوشامدیوں اور "چمچوں" کے درمیان اتنے خوش رہتے کہ اس دوران انہیں انجو کی بھی پرواہ نہ ہوتی۔ اس سے انجو اپنی توہین محسوس کرتیں۔ وہ ایک بار پھر دھیرے دھیرے راجیش سے دور ہونے لگیں لیکن سلسلہ کچھ اس طرح چلتا رہا کہ کبھی ان دونوں کے درمیان تناؤ آجاتا اور کبھی وہ ایک بار پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی پارٹی میں نمودار ہو جاتے۔

اسی زمانے میں راجیش کھنہ نے ایک بنگلہ انجو کو تحفے میں دیا۔ راجیش کو قریب سے جاننے والوں کا کہنا تھا کہ ان کی محبت اور تعلق یونہی چلے گا، یہ لڑتے بھی رہیں گے اور صلح بھی کرتے رہیں گے۔ شادی آخر کار یہ دونوں ایک دوسرے سے ہی کریں گے۔

اسی زمانے کی بات ہے، ممبئی میں ایک روز بارش ہوئی۔ موسم بہت سہانا ہو گیا، سینٹ جوزف کانونٹ اسکول میں پڑھنے والی ایک گیارہ بارہ سال کی گجراتی لڑکی اپنی ایک کلاس چھوڑ کر راجیش کھنہ کی فلم دیکھنے چلی گئی۔ وہ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ وہ فلم دیکھ چکی تھی اور اسے راجیش کھنہ کا ہر وہ مکالمہ زبانی یاد ہو چکا تھا جو انہوں نے اس فلم میں بولا تھا۔ سینٹ جوزف اسکول کی اکثر لڑکیاں راجیش کھنہ کی زبردست پرستار تھیں۔

لڑکی جب فلم دیکھ کر نکلی تو بارش تھم چکی تھی۔ تیسری مرتبہ راجیش کھنہ کی فلم دیکھنے کے بعد اس لڑکی کے ذہن پر راجیش کھنہ اور بھی زیادہ چھائے ہوئے تھے۔ وہ راجیش کھنہ ہی کے خیالوں میں گم، غیر ارادی سے انداز میں ان کے گھر "آشیر واد" کی طرف چل دی۔ اس کے دل میں راجیش کھنہ سے ملاقات کی خواہش بہت شدید ہو چکی تھی۔ گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے چوکیدار سے کہا "میں راجیش صاحب کی بہت بڑی فین ہوں اور ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

چوکیدار کو روز ہی راجیش کھنہ کے اس قسم کے نہ جانے کتنے پرستاروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ وہ چہرے پر رکھائی لاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ "صاحب گھر پہ نہیں ہیں اور کچھ پتا نہیں کب آئیں گے۔"

وہ تقریباً ہر پرستار کو یہی جواب دیتا تھا۔ اس کے الفاظ سن کر لڑکی کے چہرے پر مایوسی چھا گئی، اس کے باوجود وہ وہاں سے رخصت نہیں ہوئی بلکہ ذرا ایک طرف کو ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شاید وہ اس امید پر کھڑی ہو گئی تھی کہ اگر کچھ دیر میں راجیش کھنہ واپس آگئے تو وہ ان سے ملنے کی کوشش کرے گی یا کم از کم ان کی ایک جھلک تو دیکھ سکے گی۔

چند منٹ بعد ایک سفید فیٹ کار گیٹ کے قریب پہنچی، چوکیدار نے اس کار کو کچھ دور سے ہی دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کے قریب، بارش کی وجہ سے تھوڑا سا کیچڑ نما پانی موجود تھا۔ کار چونکہ خاصی تیز رفتاری سے آکر گیٹ کے قریب رکی تھی، اس لئے اس کے پہیوں سے وہ کیچڑ نما پانی اچھل کر پرستار لڑکی کے جوتوں، جرابوں اور یونیفارم کی اسکرٹ پر آن گرا۔ گاڑی سے انجو مہندرو اتری اور گاڑی وہیں چھوڑ کر، اسکول کی اس لڑکی کی طرف دیکھے بغیر سیدھی اندر چلی گئی۔ چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا۔ اسکول کی لڑکی نے اپنے جوتوں، جرابوں اور اسکرٹ کو دیکھا۔ مایوسی، دل شکستگی اور توہین کے احساس سے لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مرے مرے قدموں سے وہ وہاں سے واپس روانہ ہو گئی۔ وہ جب گھر پہنچی تو باقاعدہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

اس لڑکی کا نام ڈمپل کپاڈیا تھا!

☆☆...☆☆

وہ جنوری 1971ء کا ایک جمعہ تھا۔ ممبئی کے ایک کالج میں لیکچرز اپنی اپنی کلاسوں میں طلباء کی برائے نام تعداد دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس روز کسی بھی مذہب یا قومیت کے لوگوں کا کوئی تہوار وغیرہ نہیں تھا اور نہ ہی معمول سے ہٹ کر کوئی اور ایسی وجہ نظر آرہی تھی کہ کالج میں طلباء کی تعداد اتنی کم ہوتی۔ آخر ایک لیکچرر نے اپنی کلاس میں موجود دو چار لڑکوں سے پوچھ ہی لیا کہ کیا کسی کو معلوم ہے، آج کالج میں اسٹوڈنٹس اتنے کم کیوں ہیں؟

ایک طالب علم نے حیرت سے پوچھا "سر! آپ کو نہیں معلوم؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں آپ سے کیوں پوچھتا؟" لیکچرر نے کہا۔

"سر! آج راجیش کھنہ کی فلم "آنند" ریلیز ہو رہی ہے" طالب علم نے بتایا۔

یہ صرف ایک کالج کا معاملہ نہیں تھا۔ جس دن راجیش کھنہ کی فلم ریلیز ہوتی تھی کالجوں سے بیشتر، اسٹوڈنٹس سنیما ہاؤسز کا رخ کرتے تھے اور ان میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہوتی تھی۔ لڑکے اس موقع پر اپنا حلیہ بھی راجیش کھنہ جیسا بنانے کی کوشش کرتے تھے کہ شاید اس طرح وہ لڑکیوں کو متاثر کر سکیں۔ راجیش کی فلم دیکھتے وقت لڑکے لڑکیاں گویا ان کے ساتھ ساتھ شوخی، شرارت، قہقہوں اور رومانس کا سفر طے کرتے تھے لیکن "آنند" میں فلم میکر ہریشی کیش مکرجی نے ناظرین کو ہنسانے کے ساتھ رلانے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ لوگ یہ فلم دیکھ کر نکلتے تھے تو ان میں سے زیادہ تر کی آنکھیں نم ہوتی تھیں۔ اسی فلم سے امیتابھ بچن نے بولی وڈ میں اپنی موجودگی کا فلم بینوں کو صحیح معنوں میں احساس دلایا اور ان کا کیریئر کامیابی کی طرف گامزن ہوا۔

سلیل چوہدری کی موسیقی اور مکیش کی آواز نے ان گانوں کے الفاظ میں صحیح معنوں میں روح پھونک دی "میں نے تیرے لئے ہی سات رنگ کے سپنے چنے..." اور "کہیں دور جب دن ڈھل جائے..." منا ڈے نے اس فلم میں صرف ایک گانا گایا، لیکن کمال گایا "زندگی کیسی ہے پہیلی ہائے..."

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ "آنند" کو بہترین فلم اور بہترین کہانی کے فلم فیئر ایوارڈ کے ساتھ ساتھ بہترین فلم کا نیشنل ایوارڈ بھی ملا۔ راجیش کھنہ نے بہترین اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا۔ 1971ء میں "آنند" کے علاوہ بھی راجیش کھنہ کی متعدد فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں انداز، ہاتھی میرے ساتھی، مریادا، دشمن، محبوب کی مہندی اور چھوٹی بہو شامل ہیں۔

(جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

قسط:12

راجیش کھنہ کی یادگار فلم ”آنند“ کے بارے میں ایک پرانے صحافی نے چشم دید واقعہ سنایا۔ راجیش نے صحافیوں کے لئے خاص طور پر ایکسیلسیئر تھیٹر میں اس فلم کے ایک شو کا اہتمام کیا۔ صحافی کا کہنا ہے کہ جب شو ختم ہوا تو وہ راجیش کی دوست صحافی، دیوی کے ساتھ تھیٹر سے باہر آئے۔ وہ دونوں راجیش کی گاڑی کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ چند لمحے بعد راجیش بھی آ گئے اور انہوں نے پُراشتیاق انداز میں اپنی دوست صحافی، دیوی سے پوچھا ”کیسی لگی فلم؟“
”فلم تو بہت اچھی ہے... لیکن میرا تمہیں ایک مشورہ ہے... آئندہ اس لمبو کے ساتھ کام نہ کرنا۔ یہ تمہاری چھٹی کرادے گا۔“ دیوی نے جواب دیا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے، لمبو سے دیوی کی مراد امیتابھ بچن تھے، جو اس فلم میں راجیش کے ساتھ سائیڈ ہیرو تھے۔ دیوی کے مشورے کے جواب میں راجیش محض ہنس دیئے۔ انہوں نے دیوی کی بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

مشہور، پرانے فلمساز اور ہدایت کار جی پی سپی جنہوں نے راجیش کھنہ کو پہلی بار فلم میں کام کرنے کا موقع دیا تھا، ایک اور فلم ”انداز“ بنا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے نوجوان بیٹے رمیش سپی کو اس کی ہدایت کاری کے فرائض سونپے تھے۔ بطور ہدایت کار یہ رمیش سپی کی پہلی فلم تھی۔ شمی کپور اور ہیما مالنی اس کے ہیرو، ہیروئن تھے۔ اس وقت شمی کپور کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ان کی پچھلی کئی فلمیں کاروباری اعتبار سے کچھ خاص نہیں رہی تھیں۔

فلم کی باکس آفس ویلیو بڑھانے کے لئے جی پی سپی نے سوچا کہ اس میں راجیش کھنہ کو بھی شامل کر لیا جائے، جن کی حیثیت اس وقت، چڑھتے سورج کی سی تھی۔ انہوں نے سلیم جاوید سے راجیش کھنہ کے لئے اس فلم میں مہمان اداکار کے طور پر ایک رول لکھوایا۔ راجیش کھنہ چونکہ جی پی سپی کی بہت عزت کرتے تھے، اس لئے انہوں نے مہمان اداکار کے طور پر کام کرنے سے انکار نہیں کیا۔ وہ بہت کم وقت کے لئے اس فلم میں نمودار ہوئے، لیکن ان کے سامنے باقی ساری فلم ماند پڑ گئی۔ یہ بولی وڈ کی تاریخ کا سب سے مشہور اور یادگار، مہمان اداکار والا رول تھا۔

فلم کا ٹائٹل سانگ جو راجیش کھنہ اور ہیما مالنی پر اس طرح پکچرائز کیا گیا کہ وہ موٹر سائیکل پر سوار ہیں اور راجیش موٹر سائیکل کو لہراتے ہوئے گا رہے ہیں ”زندگی اک سفر ہے سہانا...“ کشور کمار نے یہ گانا اتنی خوبصورتی سے گایا اور راجیش نے اتنا اچھا پکچرائز کرایا کہ فلم کی ریلیز کے فوراً بعد ہی یہ نوجوان نسل کا پسندیدہ ترین گانا بن گیا۔ ان دنوں راجیش کے لئے زندگی واقعی ایک سہانا سفر بنی ہوئی تھی۔

”ہاتھی میرے ساتھی“ بھی راجیش کھنہ کے کیریئر کی ایک یادگار فلم تھی۔ یہ ہیرو، ہیروئن کی محبت کی کہانی نہیں بلکہ ایک کھلنڈرے، زندہ دل نوجوان اور اس کے چار پالتو ہاتھیوں کی محبت کی کہانی تھی۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ بے زبان جانوروں کی محبت انسانوں کے مقابلے میں زیادہ خالص، شدید اور بے غرض ہوتی ہے۔ آج کے دور میں تو شاید یہ مرکزی خیال ذرا مضحکہ خیز سا لگے لیکن جس دور میں یہ فلم ریلیز ہوئی، اس دور میں اسے بے پناہ پسند کیا گیا۔ راجیش کھنہ نے درحقیقت فلم کا پورا بوجھ اٹھایا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فلم کی بے مثال کامیابی کا سہرا ان کے اور ہاتھیوں کے سر تھا۔ راجیش نے یہ فلم ڈرتے ڈرتے کی تھی اور انہیں اس کی کامیابی کی کوئی خاص امید نہیں تھی، مگر اس نے کامیابی کے کئی ریکارڈ توڑ دیئے۔ شاید ویسے ہی ان دنوں راجیش کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ ممبئی کے تقریباً ہر سنیما میں انہی کی کوئی نہ کوئی فلم چل رہی ہوتی تھی اور ہر فلم 25 سے لے کر 50 ہفتے تک تو ضرور چلتی تھی۔ ان کی اوسط درجے کی فلموں بندھن، ڈولی اور آن ملو سجنا نے بھی سلور جوبلی تو کر ہی لی۔

پرانے فلمی صحافیوں کا کہنا ہے کہ راجیش کھنہ کی مقبولیت کا موازنہ دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، شمی کپور اور پھر بعد میں آنے والے امیتابھ بچن، شاہ رخ، سلمان اور عامر خان کی مقبولیت سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کچھ الگ ہی قسم کی مقبولیت تھی جس میں فلمی شائقین کا ایک عجیب قسم کا والہانہ پن، بلکہ دیوانگی شامل تھی۔ اس مقبولیت کا موازنہ کسی حد تک ایلوس پریسلے، بیٹلز، رولنگ اسٹونز اور مائیکل جیکسن کی مقبولیت سے کیا جا سکتا ہے اور اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے انڈیا میں راجیش کھنہ کا دور دیکھا ہے۔ کئی بار تو آؤٹ ڈور شوٹنگز کے دوران وہ ہجوم کے درمیان اس طرح پھنسے کہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے۔ ایک بار تو ممتاز نے حیرت انگیز طاقت، جرأت اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں ہجوم کے درمیان سے کھینچ کر نکالا۔ عورت ہوتے ہوئے بھی انہوں نے جس دلیری کا مظاہرہ کیا، اس کے چرچے ایک عرصے تک ہوتے رہے۔

1970ء کی دہائی میں ”بناکا گیت مالا“ ریڈیو سیلون کا انتہائی مقبول پروگرام تھا، جس کے میزبان امین سیانی ہوتے تھے۔ اس پروگرام میں مقبولیت کے اعتبار سے انڈین فلموں کے گانے ترتیب وار سنائے جاتے تھے۔ کئی سال تک یہ عالم رہا کہ پہلے اور دوسرے نمبر پر جو گانے ہوتے تھے، وہ راجیش کھنہ پر فلمائے گئے ہوتے تھے۔ 1970ء ہی کی دہائی میں اندرا گاندھی بھارت کی انتہائی مقبول شخصیت تھیں، لیکن راجیش کھنہ کو عوام میں ان سے بھی زیادہ مقبول سمجھا جاتا تھا۔ اس کے حق میں ایک سیاسی مضمون میں یہ دلیل دی گئی کہ راجیش کھنہ کو محض ایک فرضی کہانی پر بنائی گئی فلم میں دیکھنے کے لئے لوگ گھنٹوں قطاروں میں کھڑے ہو کر، پیسے دے کر ٹکٹ خریدتے ہیں، جبکہ اندرا گاندھی کے کسی حقیقی دورے یا دیگر سیاسی مصروفیت کی فلم مفت میں دیکھنے کے لئے بھی اس سے آدھی تعداد میں بھی نہیں آسکتے۔ اس مضمون کو بعدازاں ممبئی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا گیا۔

اسکرپٹ رائٹر جاوید اختر، راجیش کھنہ کی مقبولیت کا ایک اور آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ”بنگلور میں لاٹری نکالنے والی ایک کمپنی نے کسی طرح راجیش کھنہ کو پبلک کے سامنے قرعہ اندازی کے لئے آمادہ کر لیا۔ میں راستے میں ایک اسکرپٹ پر تبادلہ خیال کرنے کے ارادے سے ان کے ساتھ ہو لیا۔ بنگلور کی گلیوں میں اور سڑکوں پر اس روز سناٹا تھا کیونکہ سب لوگ اس جگہ پہنچے ہوئے تھے، جہاں راجیش کھنہ کو عوام کے سامنے کسی کے نام کی پرچی نکالنی تھی۔ ہم جب اس مقام پر پہنچے تو میں ہجوم دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چاروں طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ اتنے بڑے مجمع نے راجیش کھنہ کو دیکھ کر بیک وقت گہری سانس لی تو ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے بادل گرج ہوں، لوگوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ حقیقت میں اپنی آنکھوں کے سامنے، گوشت پوست سے بنے راجیش کھنہ کو دیکھ رہے تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ لاٹری عوام میں بے پناہ مقبول ہوئی اور بے حد کامیاب رہی۔“

خود راجیش کھنہ کا اس منظر کے بارے میں، بعد میں یہ کہنا تھا ”ایک لمحے کے لئے اس وقت میں نے محسوس کیا کہ شاید یہ رومن شہنشاہوں کے زمانے کا کوئی منظر ہے، میں کوئی رومن شہنشاہ ہوں اور کسی بہت بڑے میدان میں اپنے عوام کے سامنے پہنچا ہوں، مجھے خود یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی انسان، عوام میں اتنا مقبول ہو سکتا ہے۔ پھر خوشی اور تشکر سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔“

یاد رہے کہ اس زمانے میں اسٹارز کے کوئی پبلک ریلیشنز منیجر، پبلسٹی آفیسرز، امیج میکرز یا ان کے لئے کام کرنے والی ایونٹ مینجمنٹ کمپنیاں اور اس قسم کے دوسرے ادارے نہیں ہوا کرتے تھے۔ نوین نشچل جو خود بھی 1970ء اور 1980ء کی دہائی میں ایک مقبول اداکار ہوا کرتے تھے، اس زمانے کا ایک واقعہ سناتے ہیں ”میں ایک بار تاج ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا اور راجیش کھنہ باہر آرہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ راجیش کھنہ کے پیچھے پیچھے، اس ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ اس طرح باہر آ گئے جیسے راجیش کوئی جادوگر ہوں یا انہوں نے لوگوں کو ہپناٹائز کر دیا ہو اور وہ سب کے سب خواب کے سے عالم میں اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے ہوں۔ ’کاکا‘ کی موجودگی واقعی لوگوں پر جادو کر دیتی تھی۔“

نوجوانی میں اس قدر کامیابی کو بہت کم لوگ برداشت کر پاتے ہیں۔ کامیابی بہر حال ایک نشے کی طرح زیادہ تر لوگوں کے دماغوں کو چڑھ جاتی ہے۔ کچھ عرصہ تو راجیش کھنہ اپنی مقبولیت پر حیران ہوتے رہے، عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن پھر رفتہ رفتہ ان کا دماغ خراب ہونا شروع ہو ہی گیا۔ سلیم خان اس سلسلے میں ایک واقعہ سناتے ہیں۔

ایک بار ایک فلمی رسالے نے ٹائٹل پر سنجیو کمار کی تصویر کے ساتھ ان کا ایک انٹرویو شائع کیا۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ایک سنجیدہ مزاج اور عمدہ اداکار ہیں۔ ان کے بارے میں کئی دوسرے لوگوں کی آراء بھی لی گئی تھیں، جن میں اسکرپٹ رائٹر سلیم خان بھی شامل تھے۔ سنجیو کمار کو راجیش کھنہ اپنا حریف تصور کرتے تھے۔ سلیم خان نے سنجیو کمار کے بارے میں رائے دی تھی کہ وہ ایک اچھے اداکار ہیں۔ راجیش کھنہ نے یہ رائے پڑھی تو اپنے ڈرائیور کو بھیج کر سلیم خان کو بلوا لیا۔

سلیم خان جب راجیش کھنہ کے گھر پہنچے تو وہ اپنے پورچ میں اپنی دوسری، نئی امپورٹڈ کار کے بونٹ پر اپنے مخصوص فلمی اسٹائل میں بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں وہی رسالہ تھا جس میں سنجیو کمار کا انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ راجیش کھنہ بظاہر وہی انٹرویو پڑھ رہے تھے۔ سلیم خان ان کے سامنے پہنچے تو انہوں نے خاصی حد تک متکبرانہ انداز میں پوچھا۔ ”یہ آپ ہی نے کہا ہے کہ سنجیو کمار اچھے اداکار ہیں؟“

سلیم خان پہلے تو اس سوال پر خاصے حیران ہوئے لیکن پھر انہوں نے سنبھل کر اس کا جواب بہر حال اثبات میں دیا۔ راجیش کھنہ نے اپنا اسٹائل برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اور میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے... میں کیسا اداکار ہوں؟“

”مجھ سے اگر تمہارے بارے میں پوچھا گیا ہوتا کہ تم کیسے اداکار ہو... تو یقیناً میں تمہارے بارے میں بھی یہی کہتا کہ تم ایک اچھے اداکار ہو۔“ سلیم خان نے جواب دیا۔

راجیش کھنہ چند لمحے یوں خاموش رہے جیسے وہ سلیم خان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ گاڑی کے بونٹ سے اتر کر سلیم خان کو خدا حافظ کہے بغیر اندر چلے گئے۔ انہوں نے سلیم خان کو اندر آنے کے لئے نہیں کہا۔ سلیم خان کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ واپسی میں وہ ڈرائیور کو زحمت دیئے بغیر خود ہی اپنے گھر واپس آ گئے لیکن راجیش کھنہ کے رویئے سے بہر حال انہیں حیرت کا جھٹکا لگا تھا!

زیادہ تر صحافیوں اور فلم انڈسٹری کے سنجیدہ مزاج لوگوں کی، راجیش کھنہ کے بارے میں متفقہ رائے یہ ہو چکی تھی کہ وہ کبھی ساٹھ برس کے دانا، بردبار اور تحمل مزاج بزرگ کی سی باتیں کرتے ہیں اور کبھی چھ سال کے بچے کی طرح ضدی اور متلون مزاج دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے کسی اور اداکار کی تعریف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کوئی صحافی ان کے ہم عصر کسی دوسرے ہیرو کے بارے میں تعریفی الفاظ لکھ دیتا تھا تو وہ اس سے ناراض ہو جاتے تھے اور آئندہ وہ اسے فلم انڈسٹری کے ”اندر“ کی خبریں دینا یا اہم اور دلچسپ باتیں بتانا بند کر دیتے تھے۔ وہ خوشامدیوں کے حلقے میں گھرے رہنا پسند کرتے تھے اور صحافیوں میں سے بھی زیادہ تر انہی کو پسند کرتے تھے جو ان کی چاپلوسی میں لگے رہتے تھے۔ (جاری ہے)

تمکین تبسم

راجیش کھنّہ کی داستانِ حیات: ممتاز اور شرمیلا ٹیگور سے اُن کے معاشقے مشہور ہوئے

RAJESH KHANNA

قسط:13

ابتداء میں راجیش کھنہ کی، پینے پلانے کی جو محفلیں رات گئے تک جاری رہتی تھیں، ان میں فلم انڈسٹری کے مختلف شعبوں کے بڑے بڑے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ بڑے ڈائریکٹرز، رائٹرز، میوزک ڈائریکٹرز اور دیگر لوگ آتے تھے۔ گپ شپ کے ساتھ کام کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ نئے نئے آئیڈیاز پر گفتگو ہوتی تھی لیکن جوں جوں راجیش کھنہ میں خوشامد پسندی بڑھتی گئی توں توں ان محفلوں کا معیار گرتا گیا۔ راجیش کھنہ ہر ایک سے توقع رکھتے کہ وہ ان سے خوشامدانہ انداز میں بات کرے اور ان کی ہاں میں ہاں ملائے۔

ظاہر ہے، جو لوگ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے اور اپنے اپنے شعبے میں بڑا نام اور ممتاز مقام رکھتے تھے، وہ تو ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ ان محفلوں سے دور ہو گئے اور آخر کار راجیش کھنہ کے گرد صرف خوشامدیوں کا ٹولا جمع رہنے لگا جن میں کوئی بھی قابل ذکر آدمی نہیں تھا۔ راجیش میں ایک خرابی یہ بھی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ کسی دوسرے کو اپنے سے بہتر اداکار تسلیم ہی نہیں کر سکتے تھے اور ان کے سامنے اگر کوئی کسی دوسرے ایکٹر کی تعریف کر دیتا تھا تو وہ راجیش کے ناپسندیدہ افراد میں شامل ہو جاتا تھا۔ تنقید کا تو ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں رہا تھا۔ ہر ایک سے وہ صرف اپنی تعریف سننے کی توقع رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ ان میں ”ملکیت پسندی“ بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں کے ساتھ کام کر کے ان کی فلمیں سپر ہٹ رہی ہیں، وہ آئندہ صرف انہی کے ساتھ کام کریں۔ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تھا۔ ہولی وڈ کے ایک بڑے فلم ڈائریکٹر کا کہنا ہے ”ناکامی نے اتنے لوگوں کو تباہ نہیں کیا جتنے لوگوں کو کامیابی نے تباہ کیا ہے۔“ راجیش کھنہ اس کی زندہ مثال بنتے جا رہے تھے۔

ان کی شخصیت اور معمولات میں تبدیلیوں کا اثر ان کی رومانی زندگی پر بھی پڑ رہا تھا۔ ان کے اور انجو مہندرو کے تعلقات میں دراڑ آتی جا رہی تھی۔ اس میں شاید ایک اور حقیقت کا بھی دخل تھا۔ وہ یہ کہ راجیش کھنہ تو کامیابیوں کی بلندیوں کی طرف جا رہے تھے لیکن انجو مہندرو وہیں کی وہیں کھڑی تھیں۔ اوپر سے کچھ افواہیں بھی انہیں ایک دوسرے سے دور کر رہی تھیں۔ راجیش کھنہ کے بارے میں افواہیں گرم تھیں کہ خاص طور پر دو ساتھی اداکاراؤں ممتاز اور شرمیلا ٹیگور سے ان کا زوردار معاشقہ چل رہا ہے۔

ایک انٹرویو میں راجیش کھنہ نے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا ”لوگ سمجھتے ہیں کہ میں جس ہیروئن کے ساتھ کام کرتا ہوں، اس کے ساتھ میرا معاشقہ چل پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض خبروں سے تو یہ تاثر بھی عام کر دیا گیا جیسے میری پرستار کوئی بھی لڑکی اگر میرے ساتھ رات گزارنے کے لیے تیار ہوتی ہے تو میں فوراً اسے ساتھ لے کر چل دیتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ فلموں کا سپر اسٹار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خلوت کے میدان کا بھی کوئی بڑا ہیرو ہوں۔ انسان زندگی کے ہر معاملے میں پہلوان یا ہرکولیس نہیں ہوتا۔ میں ایک عام سا انسان ہوں۔ اوپر والا ہر انسان میں سبھی طاقتیں بھر کر اسے دنیا میں نہیں بھیجتا۔“

ان کے، صفائی پیش کرنے کے باوجود فلمی اخبارات و رسائل میں ان کے معاشقوں کی خبروں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ممتاز سے ان کے معاشقے کی خبریں فلمی شائقین کو اس لئے بھی معتبر لگتی تھیں کہ ممتاز ان کی پڑوسن تھی اور فلموں میں ان کے درمیان غضب کی کیمسٹری دکھائی دیتی تھی۔ راجیش کھنہ کے ساتھ جوڑی ہٹ ہو جانے کی وجہ سے ممتاز اس زمانے کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی ہیروئن بن گئی تھی۔

اُدھر انجو مہندرو کو گلہ تھا کہ اس کے کیریئر کو آگے نہ بڑھنے دینے میں راجیش کا بھی ہاتھ تھا۔ اس نے راجیش پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ وہ اس کی فلموں کی ریلیز رکوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے پہلے وہ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی انجو کو فلم میں کاسٹ ہی نہ کرے۔ راجیش کو یہ اعتراف تو تھا کہ وہ چاہتے تھے، ان کی بیوی اگر شادی سے پہلے فلموں میں کام کرتی رہی ہو تو کم از کم شادی کے بعد وہ فلموں میں کام کرنا چھوڑ دے۔ جبکہ انجو اپنی اس ضد پر قائم تھی کہ وہ شادی کے بعد بھی فلموں میں کام جاری رکھے گی۔ انہی اختلافات اور تنازعات کے درمیان ان کا رومانس اسی طرح گھسٹ رہا تھا کہ کبھی ان کے درمیان لڑائی ہو جاتی تھی اور کبھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ دکھائی دینے لگتے تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ لڑائی ہمیشہ راجیش کی وجہ سے ہی ہوتی تھی لیکن انجو کو منانے میں پہل بھی وہی کرتے تھے۔ انہوں نے انجو کو جو بنگلا تحفے کے طور پر دیا تھا، وہ آج بھی اسی میں رہ رہی ہیں۔

راجیش کھنہ کے لیے 1972ء کا آغاز ان کی فلم ”دشمن“ سے ہوا جس میں انہوں نے ٹرک ڈرائیور کا رول کیا اور اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز میں اپنے اوپر یہ گانا پکچرائز کرایا ”وعدہ تیرا وعدہ...“ اس کے بعد اسی سال مارچ میں راجیش کی یادگار فلم ”امر پریم“ ریلیز ہوئی جس میں ان کا اسٹائل بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس فلم میں ان کا کردار بالکل دیوداس ٹائپ تھا جس کے ذریعے راجیش کھنہ نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف رومانس اور شوخی و شرارت ہی کے نہیں، ٹریجڈی کے بھی بادشاہ ہیں۔

”امر پریم“ درحقیقت ایک کلاسیک بنگالی ناول پر، پہلے بنگالی زبان میں ہی ”نشی پدما“ کے نام سے بنائی گئی تھی جس میں مرکزی کردار اُتم کمار نے ادا کیا تھا۔ فلمساز اور ہدایت کار شکتی سمانتا نے جب اسے اردو میں بنانے کا فیصلہ کیا تو ہیروئن کے رول کیلئے وہ شرمیلا ٹیگور کے پاس گئے۔ شرمیلا ٹیگور ان دنوں اپنے پہلے بچے، سیف علی خان کی ماں بنی تھیں اور کافی عرصے سے وہ فلموں سے دور تھیں۔ شکتی سمانتا کو امید نہیں تھی کہ وہ فلم میں کام کرنے کیلئے ہامی بھریں گی لیکن انہوں نے جب کردار پڑھا تو وہ فوراً فلم میں کام کرنے کیلئے تیار ہو گئیں۔ کردار نہایت جاندار اور متاثر کن تھا۔ شرمیلا ٹیگور کو امید نظر آئی کہ اس کے ذریعے وہ خود کو ایک بار پھر باصلاحیت اور سنجیدہ اداکارہ تسلیم کرانے میں کامیاب رہیں گی۔

ہیرو کیلئے شکتی سمانتا کے ذہن میں پہلے راجکمار کا نام تھا۔ شکتی کو امید نہیں تھی کہ راجیش کھنہ ایک ایسی فلم میں ہیرو بننے کیلئے آمادہ ہوں گے جس میں ہیروئن کا کردار زیادہ طاقتور تھا لیکن جب راجیش کھنہ نے وہ کردار پڑھا تو انہیں لگا کہ اس میں بھی ان کیلئے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کے اظہار کے بڑے مواقع موجود تھے۔ انہوں نے وہ رول کرنے کیلئے آمادگی ظاہر کر دی اور واقعی اس کردار کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے اس کردار کو سمجھنے اور اسے زیادہ سے زیادہ بہتر انداز میں کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

وہ اُتم کمار کے پاس کلکتہ بھی گئے جنہوں نے بنگالی فلم میں یہی کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے اتم کمار سے ان کی پرفارمنس کی باریکیاں سمجھنے کی پوری کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ اتم کمار کے مقابلے میں آدھی پرفارمنس بھی دے پائے تو اسے وہ اپنی ایک بڑی کامیابی تصور کریں گے۔ انہوں نے باریک بینی سے اتم کمار کی اداکاری دیکھنے کے لیے سولہ مرتبہ بنگالی فلم ”نشی پدما“ دیکھی۔ شاید یہ بھی راجیش کھنہ کی خوش قسمتی تھی کہ اردو فلم میں ان کے کردار کا نام آنند رکھ دیا گیا۔

بنگالی فلم میں اس کردار کا نام آننتا تھا جبکہ آنند، راجیش کی ابتدائی فلموں میں کامیاب ترین فلم تھی جس میں ان کے کردار کا نام یہی تھا۔ ”امر پریم“ میں راجیش نے اپنی المیہ اداکاری کا لوہا منوا لیا۔ اس فلم کے گانے ”رینا بیتی جائے...“ اور ”چنگاری کوئی بھڑکے...“ آج بھی موسیقی کے قدردانوں میں دل سے سنے جاتے ہیں۔ شکتی سمانتا کا ارادہ اس فلم میں راجیش کھنہ کے کچھ سین کلکتہ میں، آؤٹ ڈور پکچرائز کرنے کا تھا لیکن بنگال میں بھی راجیش کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب شکتی سمانتا، راجیش اور یونٹ کے دیگر افراد کلکتہ ایئرپورٹ پہنچے تو انسانوں کا ایک سمندر راجیش کھنہ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے پہنچا ہوا تھا۔

راجیش کے پرستاروں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر شکتی سمانتا ڈر گئے اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ کلکتہ میں راجیش کے آؤٹ ڈور سین پکچرائز کرنا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہو گا۔ وہ خاموشی سے ممبئی واپس لوٹ گئے اور محبوب اسٹوڈیوز میں مصنوعی ”ہاؤڑا برج“ بنوا کر انہوں نے اپنے سین پکچرائز کئے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس زمانے میں کسی بھی جگہ راجیش کیلئے آؤٹ ڈور شوٹنگ کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ان کیلئے پہلے سے، باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے اس طرح سین لکھوانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ آؤٹ ڈور شوٹنگ پر نہ جانا پڑے۔ ”امر پریم“ راجیش کھنہ کو خود بھی اپنی فلموں میں بہت زیادہ پسند تھی۔ ڈائریکٹرز میں وہ ہریش کیش مکرجی کے سب سے زیادہ معترف تھے۔

ہریش کیش مکرجی کے ساتھ راجیش کھنہ دوسری فلم ”باورچی“ کر رہے تھے جس میں ان کے ساتھ جیا بھادری تھیں تاہم ان کی جوڑی جیا بھادری کے ساتھ نہیں تھی۔ جیا بھادری ان دنوں امیتابھ بچن کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھیں جو اس وقت تک بہت زیادہ مقبول تو نہیں ہوئے تھے لیکن بہر حال ایک ابھرتے ہوئے اداکار تھے۔ وہ جیا بہادری سے ملنے اکثر ”باورچی“ کے سیٹ پر آ جاتے تھے۔ راجیش کھنہ انہیں ذرا بھی اہمیت نہ دیتے لیکن پھر جب انہوں نے کئی بار جیا بھادری کو امیتابھ بچن سے بڑی اپنائیت سے باتیں کرتے دیکھا تو ڈانٹنے کے سے انداز میں انہیں سمجھایا ”تم اس (امیتابھ بچن) کے ساتھ اتنا گھلنے ملنے کی کوشش نہ کرو۔ اس کے ساتھ لگ کر نہ تمہارا کچھ بنے گا اور نہ ہی اس کا...!“ راجیش کھنہ نے یہ بات ایک بار نہیں، کئی بار کہی۔ آخر ایک بار شاید چِڑ کر جیا بھادری نے کہا ”ایک دن آئے گا... تم دیکھنا... اس وقت تم نہ جانے کہاں ہو گے اور وہ نہ جانے کتنا آگے ہو گا...“

کون کہہ سکتا تھا کہ جیا بھادری کی پیشگوئی ایک دن کتنی درست ثابت ہو گی! اس وقت شاید جیا بھادری نے بھی یہ بات محض چِڑ کر کی ہو گی۔ انہیں خود بھی معلوم نہیں ہو گا کہ بعض اوقات قدرت کسی کے منہ سے نکلی ہوئی بات اس طرح پوری کرا دیتی ہے کہ خود، کہنے والے کے بھی وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔

”باورچی“ میں راجیش کھنہ نے ثابت کر دیا کہ ان میں کامیڈی کی بھی زبردست صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس سے پہلے وہ دو تین فلموں میں نہایت المیہ اور بوجھل کردار کر چکے تھے۔ گو کہ ان کی وہ فلمیں بھی بے حد کامیاب رہی تھیں لیکن ”باورچی“ نے گویا انہیں اپنے اسٹائل اور اپنے امیج میں ایک نیا پن دکھانے کا زبردست موقع دیا۔ اس میں وہ ”زبردست رومانی ہیرو“ بھی نہیں تھے۔ جیا بھادری نے البتہ ”باورچی“ کے بعد ارادہ کر لیا کہ وہ آئندہ اس اداکار (راجیش کھنہ) کے ساتھ کام نہیں کریں گی جو اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ہریش کیش مکرجی نے اپنی آئندہ فلم ”نمک حرام“ میں ایک بار پھر راجیش کھنہ اور امیتابھ بچن کو ایک ساتھ کاسٹ کرنے کا پروگرام بنا لیا۔

ان دنوں اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز راج کپور مالی مشکلات کا شکار تھے۔ انہوں نے بڑی محنت اور بھاری سرمائے سے ”میرا نام جوکر“ بنائی تھی اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں لیکن فلم فلاپ ہو گئی اور انہیں مالی بحران سے دوچار کر گئی۔ انہوں نے کم سرمائے سے ایک ایسی فلم بنانے کا پروگرام بنایا جس کی بنیاد ایک نوخیز جوڑے کے رومانس پر ہو۔ راج کپور نے نہ صرف مالی مشکلات سے نکلنے کیلئے ایک ایسی فلم بنا کر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا بلکہ انہوں نے اپنے نوجوان بیٹے رشی کپور کو بھی اسی فلم کے ذریعے متعارف کرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ (جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

تمکین تبسم

قسط:14

راج کپور نے جس فلم کا منصوبہ بنایا تھا، اس کا نام ''بوبی'' رکھا گیا۔ اس کی ہیروئن کے طور پر ایک پندرہ سالہ لڑکی ڈمپل کپاڈیا کا انتخاب کیا گیا۔ ڈمپل ایک گجراتی بزنس مین چنی لال کپاڈیا کی صاحبزادی تھیں۔ چنی لال کی راجیش کھنہ سے بھی شناسائی تھی اور وہ کئی بار راجیش سے ذکر کر چکے تھے کہ ان کی بیٹی راجیش کی زبردست پرستار تھی۔

جب ''بوبی'' کی شوٹنگ جاری تھی تو فلمی دنیا میں خبریں گردش کرنے لگیں کہ راج کپور کے نوجوان صاحبزادے رشی کپور اور نوعمر ڈمپل کپاڈیا کے درمیان معاشقہ شروع ہو گیا ہے۔ شوٹنگ کو مزید کچھ دن گزرے تو ڈمپل کپاڈیا کی انگلی میں ایک انگوٹھی نظر آنے لگی جس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ انہیں رشی کپور نے پہنائی ہے۔ فلمی دنیا میں وثوق سے کہا جانے لگا تھا کہ ڈمپل کپاڈیا، کپور خاندان کی آئندہ بہو ہوں گی۔

ایک طرف یہ سلسلہ چل رہا تھا، دوسری طرف راجیش کھنہ کی خود پرستی، خوشامد پسندی اور بے اعتدالیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بی آر چوپڑا کی فلم ''کرم'' کی آؤٹ ڈور شوٹنگ 1976ء میں سری نگر مقبوضہ کشمیر میں ہونی تھی۔ بی آر چوپڑا اپنے یونٹ کے ساتھ چند دن پہلے ہی سری نگر چلے گئے۔ فلم کے ہیرو راجیش کھنہ کو بعد میں وہاں پہنچنا تھا۔ بی آر چوپڑا نے اس سے پہلے راجیش کھنہ کو اپنی فلم ''اتفاق'' میں ہیرو لیا تھا اور اب دوبارہ ان کے ساتھ کام کرنے پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنے فلمی یونٹ کے ساتھ سری نگر پہنچ کر شوٹنگ کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ جس روز راجیش کھنہ کو سری نگر پہنچنا تھا، اس روز بی آر چوپڑا سمیت پورا یونٹ بڑے اشتیاق سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ چوپڑا نے فلائٹ کی آمد کے وقت پر راجیش کھنہ کو ریسیو کرنے کے لیے ایک آدمی کو ایئر پورٹ بھی بھیج دیا۔ کئی گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ شخص منہ لٹکائے ایئر پورٹ سے واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ممبئی سے آنے والی فلائٹ پر راجیش کھنہ نہیں تھے۔

بی آر چوپڑا نے فون پر راجیش کھنہ سے رابطے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہ ہو سکا اور کچھ پتا نہ چلا کہ آخر وہ کیوں نہیں آئے تھے۔ تین دن اسی طرح گزر گئے، نہ تو راجیش کھنہ کا کچھ پتا چلا اور نہ ہی ان کا کوئی پیغام آیا۔ چوتھے دن راجیش کھنہ کا خانساماں سری نگر پہنچا۔ وہ راجیش کھنہ کے ٹکٹ پر ہوائی جہاز میں بزنس کلاس میں آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ 'صاحب' کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ شوٹنگ پر نہیں پہنچ سکے۔

راجیش کھنہ میں یہ عادت اچھی خاصی پختہ ہونے لگی تھی کہ وہ عین شوٹنگ کے وقت غائب ہو جاتے تھے۔ انہیں ہر جگہ ڈھونڈا جاتا تھا۔ ڈائریکٹر بری طرح پریشان ہو جاتا تھا۔ پھر بہت دیر بعد جا کر راجیش کھنہ پیغام آ جاتا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کا یہ غیر ذمے دارانہ رویہ بھی درحقیقت ان کی خود پسندی کی پیداوار تھا۔ جوں جوں ان کی فلمیں کامیاب ہو رہی تھیں اور ان کی مقبولیت بڑھ رہی تھی، انہیں یہ یقین ہونے لگا تھا کہ فلمیں صرف ان کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہیں، لوگ صرف انہیں دیکھنے کے لیے سینما گھروں میں آتے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ فلمسازوں کے لیے وہ ناگزیر ہو چکے ہیں اور اس احساس کا ناجائز فائدہ اٹھانے میں انہیں لطف آنے لگا تھا۔ وہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ عین شوٹنگ کے وقت ان کے غائب ہونے سے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور دیگر لوگوں کو کتنی پریشانی ہوتی تھی اور ان کا کتنا نقصان ہوتا تھا۔

ان کی سب سے بڑی مداح صحافی، دیوی نے بھی اپنی ایک تحریر میں اعتراف کیا کہ سُپر اسٹار بننے سے پہلے راجیش کھنہ زیادہ اچھے انسان تھے اور اس وقت ان سے مل کر انسان کو خوشی ہوتی تھی۔ دوسری طرف، رات گئے تک ان کی پینے پلانے کی محفلوں کی وجہ سے معمولاتِ زندگی درہم برہم تھے۔ ان کے لیے دن گویا سہ پہر کے تین چار بجے شروع ہوتا تھا۔ شاید ان کی ایک خوبی کی وجہ سے اُس وقت تک ان کا زوال شروع نہیں ہوا تھا... اور وہ یہ کہ ایک بار سیٹ پر پہنچ جانے کے بعد وہ اپنا کام نہایت تیزی سے، اور بے حد عمدہ انداز میں مکمل کرا دیتے تھے۔ ڈائیلاگ وہ بہت جلد یاد کر لیتے اور ان کی پرفارمنس دیکھ کر ڈائریکٹر وغیرہ اپنا غصہ بھول جاتے۔

کامیابی کے نشے نے یوں تو تقریباً ہر سُپر اسٹار کا دماغ کسی نہ کسی حد تک خراب کیا تھا لیکن راجیش کھنہ نے اس معاملے میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ان کی جتنی زیادہ ناز برداری ہوتی، اتنا ہی زیادہ وہ اُونچی ہواؤں میں اُڑنے لگتے۔ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تو ان کے آگے پیچھے پھرتے ہی تھے، فلمی صحافی بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ فلمی اخبارات و رسائل ان کی تصاویر، انٹرویوز اور تذکرے سے بھرے نظر آتے۔ انہیں چھینک بھی آ جاتی تو اس کی بھی خبر بنتی۔

سابق فلمی صحافی خاتون انگرڈ البکرک کی تو نجی زندگی میں بھی راجیش کھنہ مرکزی کردار بن گئے تھے۔ انگرڈ صحافی بننے سے پہلے اجمیر میں رہتی تھیں اور لڑکپن سے ہی راجیش کھنہ کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے راجیش کھنہ کی فلم ''بہاروں کے سپنے'' دیکھی اور اس وقت سے راجیش کھنہ کو دل میں بسا لیا۔

اپنے اس عشق کے بارے میں انہوں نے بعد میں لکھا ''ہم جیسے لوگ جو چھوٹے چھوٹے شہروں یا گاؤں دیہات میں پرورش پاتے ہیں، عموماً ان کی زندگی خاصی بے کیف اور غیر دلچسپ ہوتی ہے۔ اپنی زندگی میں کچھ رنگ بھرنے کے لیے وہ خیالوں ہی خیالوں میں کسی کو اپنا دوست، غمگسار یا محبوب بنا لیتے ہیں۔ میرے خیالی محبوب راجیش کھنہ تھے۔ میں جب زیادہ خوش یا زیادہ اُداس ہوتی تو اپنے مکان کی ٹیرس پر چلی جاتی اور دل ہی دل میں، خیالوں میں راجیش کھنہ سے باتیں کرتی۔ میں انہیں بتاتی کہ کس بھائی یا بہن نے کیا کہہ کر میرا دل دکھایا ہے، کس سے میرا جھگڑا ہوا ہے۔ خوشی کی باتیں بھی اس میں انہی سے شیئر کرتی۔ تعلیم کے میدان میں مجھے کیا کامیابی نصیب ہوئی، کس نے میری تعریف کی، یہ سب کچھ میں انہیں بتاتی۔ میں نے تصور ہی تصور میں انہیں یہ بھی بتایا کہ میں مستقبل میں راہبہ بننا چاہتی ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ راجیش کھنہ کو میرا یہ خیال پسند نہیں آیا تھا۔ میں تصور ہی تصور میں انہیں صرف ''راجیش'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔''

راجیش کھنہ کے ساتھ اپنے اس تصوراتی عشق کی وجہ سے انگرڈ نے ان کی فلم ''ارادھنا'' 23 مرتبہ دیکھی۔ ''آن ملو سجنا'' انہوں نے 21 مرتبہ دیکھی اور ''کٹی پتنگ'' چار مرتبہ۔ پھر ایک وقت آیا جب انگرڈ نے فیصلہ کیا کہ اب ممبئی چل کر اپنے آئیڈیل اور خیالی محبوب سے ملنا چاہیے۔ انہیں اُمید تھی کہ راجیش کھنہ انہیں دیکھتے ہی پسند کر لیں گے اور ان سے شادی کر لیں گے۔ تاہم ممبئی پہنچ کر انگرڈ نے پہلے ایک میڈیا کورس میں داخلہ لیا۔ کورس مکمل کرنے کے بعد انہوں نے انگریزی کے ایک فلمی رسالے میں ملازمت حاصل کر لی۔ ان کے خیال میں راجیش کھنہ تک پہنچنے کا یہ ایک نہایت موزوں اور باعزت راستہ تھا۔ انہیں اس دن کا انتظار تھا جب راجیش کھنہ سے ان کی ملاقات ہو گی اور وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں گی۔

آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب انہوں نے راجیش کھنہ سے انٹرویو کے لیے ٹائم لے لیا۔ انگرڈ کے لیے وہ محض ایک ایسا دن نہیں تھا جب ایک صحافی لڑکی کی ایک فلمی سُپر اسٹار کا انٹرویو لینے جا رہی تھی بلکہ اس کے لیے وہ ایک ایسا دن تھا جب ایک نوجوان لڑکی اپنے وجود میں سر سے پاؤں تک جذبات کی تھرتھراہٹ لیے اپنے اس محبوب سے ملاقات کے لیے جا رہی تھی جس کی لاعلمی میں وہ کئی برس سے دل ہی دل میں اس کی پرستش کر رہی تھی۔

انگرڈ نے بعد میں خود اس ملاقات کا احوال کچھ یوں لکھا ''راجیش کھنہ سے میری ملاقات محبوب اسٹوڈیو میں طے پائی تھی۔ میں جب وہاں پہنچی تو وہ ایک لان نما جگہ پر بڑی سی چھتری کے سائے میں بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں نے ان سے انٹرویو کے لیے ٹائم لیا تھا۔ انہوں نے پُرسکون لہجے میں کہا ''ہاں... ٹھیک ہے... آ جائیں...'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اندر کی طرف چل دیئے۔ میں ان کے پیچھے تھی۔ انہوں نے ایک دروازہ کھولا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دروازہ کھول کر پہلے مجھے اندر آنے کے لیے کہیں گے لیکن وہ پلٹ کر دیکھے بغیر اندر چلے گئے اور دروازہ اس طرح جھٹکے سے بند ہوا کہ میرا چہرہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ جب میں نے ذرا خجالت اور شرمندگی سی محسوس کرتے ہوئے خود دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل گھمانے کی کوشش کی تو مجھے پتا چلا کہ دروازہ لاک ہو چکا ہے۔ شاید کوئی بھی اندازہ نہ کر سکے کہ اس وقت میں نے خود کو کتنی شرمندہ اور خجالت زدہ محسوس کیا۔ میرے دل میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا عشق سمندر اس لمحے یکا یک خشک ہو گیا۔ میں خیالوں کی جن خوبصورت بلندیوں پر آج تک پرواز کرتی آئی تھی، ان سے یکدم، دھڑام سے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر آ گری۔ خیالوں اور حقائق کی دنیا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ حقیقت کبھی کبھی انسان کو بری طرح ڈس لیتی ہے لیکن پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ میں جلد ہی حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔

راجیش کھنہ جس سانچے میں ڈھل رہے تھے، اس کی طرف ایک اداکارہ کے انٹرویو میں اشارہ ملتا ہے۔ یہ انٹرویو راجیش کھنہ کے عروج کے زمانے میں ہی ایک رسالے میں چھپا۔ اداکارہ نے مختلف فلمی ہیروز کے بارے میں رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا ''تمام اداکارائیں منوج کمار کی عزت کرتی ہیں، راجیش کھنہ سے خوف کھاتی ہیں، رندھیر کپور سے محبت کرتی ہیں اور دھرمیندر کو اپنا آپ کو سونپنا چاہتی ہیں۔''

یہ حقیقت ہے کہ راجیش کھنہ کی شخصیت کو بیان کرنے کے لیے اس زمانے میں فلم انڈسٹری کے اکثر لوگ لفظ ''خوف'' استعمال کرنے لگے تھے۔ راجیش کھنہ اپنے بارے میں اس طرح کے تبصرے پڑھ کر اپنی اصلاح کی ضرورت محسوس کرنے کے بجائے اور بھی زیادہ چڑچڑے اور بد مزاج ہونے لگے تھے۔ ان کے چمچے انہیں بتاتے کہ لوگ اصل میں ان سے جلتے ہیں اور فلم انڈسٹری میں ان کے خلاف گروپ بازی ہوتی رہتی ہے۔ راجیش کھنہ میں ایک خرابی یہ بھی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ بلا تحقیق و تصدیق اپنے چمچوں کی بات پر یقین کر لیتے تھے۔ کوئی بھی چمچہ اگر آ کر انہیں بتا دیتا تھا کہ فلاں شخص ان کے خلاف بات کر رہا تھا، تو راجیش کھنہ اس شخص سے بات کرنے یا تصدیق کرنے کے بجائے فوراً اس شخص کے خلاف ہو جاتے تھے اور اسے اپنا دشمن تصور کرنے لگتے تھے۔

اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ روز بہ روز تنہا ہوتے جا رہے تھے۔ وہ دوست کم اور دشمن زیادہ بناتے جا رہے تھے۔ اوپر سے ان کی مصروفیت انہیں زندگی کے کسی مسئلے کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے دھڑا دھڑ فلمیں سائن کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے مداح انہیں زیادہ سے زیادہ فلموں میں دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے دھڑا دھڑ فلمیں سائن کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے پرستار انہیں سینما اسکرین پر دیکھتے دیکھتے کبھی بور نہیں ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جن فلموں میں کام کر رہے تھے، ان میں سے بیشتر کی کہانیاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں اور وہ اپنے کرداروں کے اعتبار سے ہر فلم میں اپنا انداز بھی الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی اداکاری میں ایک بے عنوان سی یکسانیت نظر آنے لگی تھی جس کا احساس شاید ان کے، بہت زیادہ چاہنے والوں کو بھی ہونے لگا تھا۔

(جاری ہے)

انہوں نے ڈمپل کپاڈیا کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات: قسط:15

1972ء کے وسط میں راجیش کھنہ کی فلم ''دل دولت دنیا'' ریلیز ہوئی جو بری طرح فلاپ ہوگئی۔ دو سال پہلے ''ارادھنا'' سے راجیش کھنہ کی فلموں کی کامیابی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اور جس نے انہیں سپر اسٹار بنا دیا تھا، یہ اس میں پہلی دراڑ تھی لیکن راجیش نے جلد ہی فلم ''باورچی'' کی اوسط درجے کی کامیابی سے سنبھالا لے لیا اور اپنی کامیڈی کی صلاحیتیں بھی منوا لیں لیکن یہ سب عارضی تھا۔ اس کے بعد راجیش کھنہ کی فلمیں تواتر سے فلاپ ہونے لگیں۔ ان کے پرستاروں نے گویا انہیں سر، آنکھوں پر بٹھانا چھوڑ دیا تھا۔

اس کی وجہ یہ بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو کر آنکھیں بند کر کے فلمیں سائن کئے جا رہے تھے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ کہانی خواہ کیسی ہی بے جان اور بے سر و پا ہو لیکن لوگ انہیں دیکھنے کے لئے سنیما ہاؤس ضرور آئیں گے یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس اسکرپٹ کو پرکھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ وہ اندازہ ہی نہیں لگا پاتے تھے کہ کہانی کیسی تھی اور اس میں ان کا کردار کیسا تھا۔ وہ خود اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ وہ کسی بھی پروڈیوسر کے سامنے اس کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر ہی نہیں سکتے تھے، ہر ایک انہیں کسی نہ کسی طرح آمادہ کر ہی لیتا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو، بہر حال! جتنی تیزی سے ان پر عروج آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے زوال آنے لگا۔

یکے بعد دیگرے ان کی فلمیں ''شہزادہ''، ''جورو کا غلام'' اور ''میرے جیون ساتھی'' فلاپ ہو گئیں، حالانکہ ان میں سے ''میرے جیون ساتھی'' کے گانے عمدہ تھے۔ مثلاً ''او مرے دل کے چین''، ''چلا جاتا ہوں'' اور ''دیوانہ لے کے آیا ہے'' وغیرہ۔ راجیش کی فلموں کی کامیابی میں اچھے گانوں کا بڑا ہاتھ ہوتا تھا لیکن اس فلم کو اچھے گانے بھی کامیاب نہ کرا سکے۔ یہ ناکامیاں خود راجیش کھنہ کے لئے بھی ایسے دھچکے تھے جن کے بارے میں انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔

وہ اخبار اور رسالے جو ان کی بڑی بڑی تصویریں اور لمبے لمبے انٹرویو چھاپتے تھے، ان کا لہجہ بھی راجیش کھنہ کے بارے میں بدلنے لگا۔ ان کی سب سے گہری دوست صحافی دیوی نے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ''راجیش کھنہ اپنی گفتگو کے دوران کبھی ہمیں کسی کے زوال کی کہانی سناتے تھے اور کبھی کسی اور کے زوال کی! لیکن شاید انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زوال خود ان پر بھی آ سکتا ہے۔''

1972ء میں ریلیز ہونے والی ان کی آخری فلم ''مالک'' تھی۔ اس کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے اپنی اور اپنی فلم کی پبلسٹی کی مسلسل مہم چلانے کی غرض سے پوری ٹیم ملازم رکھی۔ اس سے پہلے وہ پبلک ریلیشننگ یا پبلسٹی کی غرض سے ایک آدمی بھی رکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی اس ٹیم نے ''مالک'' کو کامیاب بنانے کے لئے بڑے پاپڑ بیلے اور اس فلم کو ریلیز بھی دیوالی کے موقع پر کیا گیا۔ انڈیا کی فلمی دنیا میں دیوالی کو فلموں کی ریلیز کے لئے بڑا ''بھاگوان'' سمجھا جاتا ہے۔ اس تہوار کے موقع پر ریلیز ہونے کی وجہ سے بعض کمزور فلمیں بھی اچھا بزنس کر لیتی ہیں، لیکن راجیش کھنہ کی ''مالک'' ان ساری کوششوں کے باوجود بری طرح فلاپ ہو گئی۔

راجیش کھنہ یکے بعد دیگرے فلموں کی ناکامی کے باوجود اپنے سپر اسٹار کے خول سے نکلنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ وہ فلموں کی ناکامی کی رپورٹیں پڑھتے تو غصے سے کہتے۔ ''میری فلمیں فلاپ ہو رہی ہیں، میں تو فلاپ نہیں ہوا۔ میں اب بھی سپر اسٹار ہوں۔''

انجو مہندرو کے ساتھ بھی ان کی چڑچڑاہٹ اور بد مزاجی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دونوں محسوس کرتے تھے کہ ان کی ایک دوسرے کے ساتھ توقعات پوری نہیں ہو رہیں۔ یہ احساس دونوں کو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے دور لے گیا اور آخر کار ایک روز محبت کا یہ بندھن ٹوٹ گیا۔ تاہم ان کے درمیان میل ملاقات مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ ''بوبی'' ابھی زیر تکمیل ہی تھی۔ ایک روز احمد آباد میں ایک تقریب میں انہوں نے اس فلم کی ہیروئن ڈمپل کپاڈیا کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہیں بعد میں پتا چلا کہ وہ اس زمانے میں اس لڑکی کو کئی بار دیکھ چکے تھے، جب وہ محض چھوٹی سی ایک بچی تھی۔ اس وقت انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نوجوانی کے آغاز میں ہی وہ ایسا رنگ روپ نکالے گی۔ انہوں نے ڈمپل کو ادھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھا تو ان کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔ اسی دوران ڈمپل نے ایک ادائے خاص سے ان کی طرف دیکھا تو وہ ماضی کی اپنی ساری محبتیں اور معاشقے بھول گئے۔

احمد آباد سے واپسی پر ڈمپل اسی جہاز میں تھی جس میں راجیش جا رہے تھے۔ راجیش کو ڈمپل کے برابر والی سیٹ خالی نظر آئی تو انہوں نے نہایت شائستگی سے انگریزی میں پوچھا۔ ''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ضرور... سر!'' ڈمپل نے قدرے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

اس کے بعد راستے بھر باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی لفظوں میں اور کبھی نظروں ہی نظروں میں!

ممبئی آنے کے بعد ڈمپل نے بار بار راجیش کے گھر پر فون کیا لیکن بات نہیں ہو سکی۔ راجیش رات گئے گھر پہنچتے تھے، تاہم کچھ عرصے بعد دونوں کے درمیان رابطہ ہو گیا، پھر ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ ان کے رومانس کی افواہیں اڑنے لگیں۔ اخباروں، رسالوں کو چٹ پٹا موضوع مل گیا۔ انجو مہندرو سے راجیش کا تعلق مکمل طور پر نہیں ٹوٹا تھا۔ اس نے ڈمپل کے بارے میں واضح طور پر حسد و رقابت کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس کے خیال میں ڈمپل کم عمر ضرور تھی لیکن بہت تیز اور چالاک لڑکی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب راجیش اور انجو دونوں سے بیک وقت ڈمپل کا سامنا ہوتا تھا تو ڈمپل انہیں انکل اور آنٹی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

ایک بار راجیش نے ڈمپل کو اس کے والدین سمیت اور اپنے چند دوستوں کو بھی ساتھ لے کر کھنڈالا جانے اور وہاں ایک ہوٹل میں رنگا رنگ پارٹی کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ جب وہاں پہنچ گئے تو پیچھے انجو کو بھی اس پروگرام کی بھنک پڑ گئی۔ اس نے راجیش کے سیکرٹری سے معلومات حاصل کرنا چاہی لیکن سیکرٹری پرشانت صاف مکر گیا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ انجو بڑے غصے سے کھنڈالا روانہ ہو گئی۔ راجیش اور اس کے مہمان وہاں ''التاج ہوٹل'' میں مقیم تھے۔ موبائل فون تو اس زمانے میں ہوتے نہیں تھے، تاہم پرشانت نے ہوٹل فون کر کے راجیش کو خطرے سے خبردار کر دیا۔ وہ لوگ فوراً وہاں سے غائب ہو گئے لیکن کسی اور جگہ جا کر انہوں نے پارٹی بہر حال منعقد کی۔

انجو وہاں سے ناکام اور غصے میں بھری واپس آئی۔ دوسرے روز راجیش اور دیگر افراد بھی واپس آ گئے۔ راجیش کے سیکرٹری پرشانت نے انہیں انجو کے ردعمل کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس وقت راجیش کے ماموں بھی وہاں موجود تھے جو راجیش کے تقریباً تمام معاملات سے باخبر رہتے تھے۔ راجیش نے اسی وقت ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''انجو یا ڈمپل...؟ آپ دونوں فیصلہ کریں، تب تک میں واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔''

راجیش کے جانے کے بعد ان کے سیکرٹری اور ماموں، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں احساس تھا کہ وہ ایک اہم فیصلے کی گھڑی تھی۔ راجیش واپس آئے تو ان دونوں نے بیک وقت کہا۔ ''ڈمپل...!''

راجیش، انجو سے اپنا تعلق باعزت اور پر وقار انداز میں ختم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ دوسرے روز ان کے ڈرائیور نے ہچکچاتے ہوئے انہیں بتایا۔ ''انجو میم صاحب نے آپ کیلئے پیغام دیا ہے کہ آئندہ اگر آپ نے ان کے گھر میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو وہ اپنے گورکھا چوکیدار سے کہہ کر آپ کو اٹھوا کر باہر پھنکوا دیں گی۔''

ظاہر ہے، یہ پیغام سن کر راجیش کو بے پناہ غصہ آیا۔ ایک تو پیغام ایسا، اوپر سے وہ راجیش کے ڈرائیور کے ذریعے بھجوایا گیا۔ مزید ستم ظریفی یہ تھی کہ انجو، راجیش کو جس گھر سے اٹھوا کر باہر پھنکوانے کی بات کر رہی تھی، وہ اسے راجیش نے ہی خرید کر دیا تھا۔ بہر حال راجیش نے خود پر ضبط کیا اور کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن اس دن سے بہر حال ان کے راستے الگ ہو گئے۔

اس کے بعد جلد ہی راجیش کھنہ نے ایک رات جوہو کے علاقے میں ساحل سمندر پر ڈمپل کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے اسے شادی کی پیشکش کر دی۔ ڈمپل حیران رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اتنا بڑا اسٹار اتنی جلدی اسے شادی کی پیشکش کر دے گا۔ اس وقت ڈمپل کی عمر بمشکل سولہ سال تھی اور رشی کپور سے اس کے رومانس کی خبریں مشہور تھیں، حتیٰ کہ اس وقت بھی اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی موجود تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اسے رشی کپور نے پہنائی تھی۔ راجیش نے وہ انگوٹھی اتار کر سمندر میں پھینک دی جو چاندنی میں جھلملاتی لہروں کے درمیان فوراً ہی غائب ہو گئی۔ ڈمپل نے صرف ایک لمحے سوچا اور پھر لرزتی آواز میں ''ہاں'' کہہ دیا۔

راجیش کی ڈمپل سے شادی جتنی عجلت میں ہوئی، اس طرح شادیاں کم ہی ہوتی ہوں گی۔ کارڈ چھپوانے کی نوبت بھی نہیں آ سکی۔ مہمانوں کو بذریعہ ٹیلیگرام مدعو کیا گیا۔

راجیش کھنہ کی اس طرح اچانک اور قطعی غیر متوقع شادی کی خبر فلم انڈسٹری کیلئے ہی نہیں بلکہ راجیش کے پرستاروں کیلئے بھی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے رشی کپور سے اظہار ہمدردی بھی کیا۔ ان کے بارے میں تاثر یہی تھا کہ وہ دل و جان سے ڈمپل کے عشق میں گرفتار تھے۔ ایک پرانے فلمی صحافی نے لکھا۔ ''میں نے شیرٹن ہوٹل کے کافی بار میں کافی پیتے ہوئے رشی کپور کی دلجوئی کی کوشش کی تو رشی بولے۔ ''بھئی...! اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے شادی کر رہے ہیں تو مجھے اس سے کیا لینا۔'' رشی کہنے کو تو یہ کہہ رہے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اگر اس موضوع پر گفتگو کچھ دیر اور جاری رہتی تو شاید ان کی پلکوں تلے مچلتے آنسو رخساروں پر ڈھلک آتے۔''

بہت سی افواہوں اور قیاس آرائیوں کے درمیان 27 مارچ 1973ء کو راجیش کھنہ کی شادی ڈمپل کپاڈیا سے ہو گئی۔ وقت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ راجیش کھنہ کی بارات انجو مہندرو کے گھر کے سامنے سے گزری۔ بعض لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ فلموں کی مسلسل ناکامی سے نہ صرف راجیش کھنہ کی انا مجروح ہو رہی تھی، بلکہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی فکر مند تھے۔ اس لئے انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہونے کے علاوہ اپنے کیریئر کو سہارا دینے کیلئے بھی ایک کم عمر، ابھرتی ہوئی اداکارہ سے شادی کی تھی جو ان کی زبردست پرستار بھی تھی۔

راجیش کھنہ کی شادی میں ہزاروں افراد شریک ہوئے اور میڈیا میں اس کی بہت دھوم مچی۔ اس شادی نے ثابت کر دیا کہ ابھی راجیش کھنہ کو ایک فلاپ یا غیر مقبول اداکار قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ راج کپور نے بھی شادی میں آ کر اپنی فلم ''بوبی'' کی ہیروئن کو شادی کی مبارکباد دی، جس نے فلم مکمل ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور شادی کر لی تھی۔

دلیپ کمار، کئی بڑے فلم پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز اور نامور صحافی بھی شادی میں موجود تھے۔ شادی کی رسوم کے بعد ایک کاک ٹیل پارٹی دی گئی جس میں صرف اسٹارز اور دیگر خاص خاص لوگ مدعو تھے۔ رشی کپور بھی اس پارٹی میں موجود تھے۔ چنی لال کپاڈیا خوش تھے کہ ایک سپر اسٹار ان کا داماد بنا تھا البتہ ان کی بیگم بٹی کپاڈیا کو ذرا تشویش تھی کہ ان کی بیٹی اور داماد کی عمروں میں خاصا فرق تھا۔

(جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

قسط:16

راجیش کھنہ کی فلمیں فلاپ ہونے کا دور عارضی تھا۔ ان کی مصروفیات میں کوئی کمی نہ آئی، البتہ اب یہ ضرور ہونے لگا کہ اگر سال میں ان کی پانچ چھ فلمیں ریلیز ہوتیں تو ان میں سے دو تین کو اوسط درجے کی کامیابی ملتی اور باقی فلاپ ہو جاتیں۔ ان کی مارکیٹ ویلیو بہرحال کم ہونے لگی۔ کئی ڈائریکٹرز نے اس لئے انہیں کاسٹ کرنا چھوڑ دیا کہ اب وہ ان کے نخرے نہیں اٹھا سکتے تھے۔ امیتابھ بچن بہت تیزی سے راجیش کھنہ کی جگہ لے رہے تھے۔

امیتابھ کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اسکرپٹ بھی اچھے مل رہے تھے اور ڈائریکٹر بھی۔ فلمی شائقین کا رجحان بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ ایکشن فلمیں پسند کی جانے لگی تھیں اور امیتابھ بچن اپنے "اینگری ینگ مین" کے امیج کے ساتھ ان میں خوب جچنے بھی لگے تھے۔ اپنی ذاتی صفات کی بنا پر بھی وہ رائٹرز، ڈائریکٹرز، پروڈیوسرز، سبھی کو اچھے لگتے تھے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے، ہر ایک سے تعاون کرتے تھے، ڈسپلن کے پابند تھے اور فلمی شائقین میں بھی تیزی سے مقبول ہو رہے تھے۔

راجیش کی شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد "زنجیر" ریلیز ہوئی، جس کے ہیرو امیتابھ بچن تھے اور رائٹر سلیم جاوید۔ اسی فلم نے امیتابھ کو "اینگری ینگ مین" کا خطاب دلوایا تھا اور اس کے بعد وہ بولی وڈ کے افق پر چھاتے چلے گئے، جبکہ راجیش کھنہ کی مقبولیت کا چاند دھیرے دھیرے گہناتا چلا گیا۔ خوشامدیوں کے ٹولے نے اب بھی راجیش کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ انہی کی وجہ سے راجیش کبھی اپنی خامیوں کی اصلاح نہیں کر سکے اور نہ ہی انہیں زمانے کے تغیرات یا وقت کی تبدیلیوں کو سمجھنا آیا۔ وہ جب امیتابھ بچن کو روز بہ روز کامیابیوں کی نئی منزلوں کی طرف بڑھتے دیکھتے تو یہی کہتے کہ وہ سازشوں کے ذریعے آگے بڑھ رہا ہے اور انہیں پیچھے دھکیل رہا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ امیتابھ تو سر جھکا کر، اپنی دھن میں، اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ راجیش کے بارے میں سازش کرنا تو درکنار، ان کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات تک نہیں کرتے تھے۔

ادھر راجیش کھنہ کا کیریئر ڈانواڈول تھا، ادھر ان کی گھریلو زندگی بھی انتشار کا شکار تھی۔ لگتا تھا کہ راجیش کھنہ اور ڈمپل کپاڈیا، دونوں نے ہی ایک دوسرے سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ پوری نہیں ہوئی تھیں۔ شادی کے آٹھ ماہ بعد ڈمپل کی فلم "بوبی" ریلیز ہوئی اور سپرہٹ رہی۔ اس کی شوٹنگ کے دوران ہی چونکہ ڈمپل کی شادی ہو گئی تھی، اس لئے فلم کے مناظر میں کہیں کہیں ان کے ہاتھوں پر مہندی بھی نظر آتی ہے۔ فلم مکمل ہونے سے پہلے وہ امید سے ہو گئی تھیں، وہ جب فلم کے پریمیئر شو پر آئیں تو تقریباً پورے دنوں سے تھیں۔

اس فلم کی کامیابی نے راج کپور کو دوبارہ ان کے پیروں پر کھڑا کر دیا، ورنہ ان کے "آر کے اسٹوڈیو" کی فروخت کی نوبت آنے والی تھی۔ فلم کی کامیابی کی وجہ سے ڈمپل کپاڈیا کو دھڑا دھڑ مزید فلموں کی آفرز ہونے لگیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ خالص گھریلو بیوی بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ پھر وہ ایک پیاری سی بچی کی ماں بھی بن گئیں۔ راجیش اس بچی کا نام ٹینا رکھنا چاہتے تھے لیکن پھر کئی لوگوں کی دخل اندازی کے بعد آخرکار بچی کا نام ٹوئنکل رکھا گیا۔ اسی ٹوئنکل کھنہ کی، آگے چل کر اداکار اکشے کمار سے شادی ہوئی۔

ٹوئنکل ابھی چھوٹی ہی تھیں کہ ڈمپل کپاڈیا ایک بار پھر امید سے ہو گئیں، اس بار نہ جانے کیوں راجیش کھنہ نے امید لگا لی تھی کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا، مگر اس مرتبہ بھی ان کے ہاں بیٹی ہی ہوئی۔ دوسری بیٹی کا باپ بننے پر راجیش کھنہ کی مایوسی اور دل شکستگی کا یہ عالم تھا کہ کئی ماہ تک انہوں نے بیٹی کی شکل بھی نہیں دیکھی اور اس دوران بچی کا نام تک نہیں رکھا جا سکا، پھر جب ایک روز آخرکار راجیش نے بچی کو دیکھا تو ایک باپ کی حیثیت سے ان کی فطری محبت بیدار ہو گئی۔ بچی کا نام رنکی رکھا گیا اور رفتہ رفتہ راجیش اس سے بھی اسی طرح پیار کرنے لگے جس طرح وہ اپنی پہلی بیٹی ٹوئنکل سے کرتے تھے۔

اس دوران راجیش کھنہ کا کیریئر بھی اتار چڑھاؤ کا شکار تھا۔ کہنے کو تو ان کی ایک سال میں کئی فلمیں ریلیز ہوتی تھیں لیکن ان میں سے مشکل سے ہی کوئی ایسی ہوتی تھی جسے بہت کامیاب کہا جا سکے۔ تاہم فلموں کی زیادہ تعداد کی وجہ سے ان کی مصروفیت بہرحال برقرار تھی، جس کے باعث وہ گھر اور ڈمپل کو بھی وقت نہیں دے پاتے تھے۔ ظاہر ہے ایک نوجوان بیوی کی حیثیت سے ڈمپل کو شکوہ ہوتا تھا کہ جس شوہر کیلئے انہوں نے اپنا فلمی کیریئر قربان کر دیا، بیچاسوں فلموں کی آفرز ٹھکرا دیں اور بے پناہ اصرار کرنے والے پروڈیوسروں کے سامنے، ان کی فلمیں سائن کرنے سے انکار کرتی رہیں، اس شوہر کے پاس ان کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔

ازدواجی زندگی میں اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی شکایتیں بڑھتے بڑھتے بڑے بڑے گلے شکوؤں میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ معمولی دوری بڑھ کر وسیع خلیج بن جاتی ہے۔ دوسری طرف راجیش کھنہ کی فلموں کی ناکامی ان کے مزاج پر ایسے اثرات مرتب کر رہی تھی کہ وہ اپنی گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کے بجائے اسے بدتر بنانے کا سبب بن رہے تھے۔ نوبت یہ آئی کہ ایک بار ڈمپل بچیوں کو لے کر میکے چلی گئیں۔ دوسری طرف راجیش انہیں منانے کے لئے آنے کی بجائے طویل شوٹنگ کے لئے کشمیر چلے گئے۔ ان کے درمیان طلاق کی افواہیں اڑنے لگیں، رسالوں اخباروں کو چٹخارے دار موضوع مل گیا۔

ڈمپل میکے میں پڑی سلگتی اور کڑھتی رہتیں۔ اس دوران کئی بار انہوں نے یہ بھی سوچا کہ وہ دوبارہ فلموں میں کام شروع کر دیں۔ اس سے پہلے کہ اس ارادے پر عمل درآمد کی نوبت آتی، راجیش کھنہ شوٹنگ ختم ہونے پر کشمیر سے لوٹ آئے اور پھر ایک روز ڈمپل نے انہیں اپنے گھر کے گیٹ پر کھڑے دیکھا۔ وہ ڈمپل کو لینے آئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ڈمپل گویا سارے گلے شکوے بھول گئیں، انہیں احساس ہوا کہ زندگی میں انہوں نے صرف اسی شخص سے محبت کی تھی اور یہ محبت شاید کبھی ختم نہ ہو سکے، وہ راجیش کھنہ کے ساتھ گھر واپس آ گئیں۔

ڈمپل گھر تو واپس آ گئیں لیکن ان کی توقعات اس بار بھی پوری نہ ہو سکیں۔ تجدید محبت کی گرمجوشی چند دن ہی برقرار رہی، اس کے بعد پھر وہی بیزار کن روز و شب شروع ہو گئے۔ ادھر کیریئر کے معاملے میں بھی ناکامیاں بدستور راجیش کھنہ کے تعاقب میں تھیں اور جب ایک اداکار کی فلمیں فلاپ ہونے لگیں تو اس کا سارا گرد و پیش، اس کی ساری دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ اس صورتحال میں، بجائے اس کے کہ راجیش خود کو سنبھالتے، اپنی اصلاح کرتے، ان کی بدمزاجی اور بھی بڑھ گئی، لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ اور بھی خراب ہو گیا۔ ان کے سسرال والے بھی شکایت کرنے لگے کہ ڈمپل کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہیں ہے۔

ان کی شادی کو نو سال گزر چکے تھے لیکن میاں بیوی میں ہم آہنگی بڑھنے کے بجائے ناچاقی بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈمپل دوبارہ فلموں کی طرف جانے کے بارے میں شدت سے سوچنے لگی تھیں۔ ویسے تو راجیش اپنے انٹرویو میں یہی کہتے تھے کہ انہیں ڈمپل کی فلموں میں کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، وہ خود ہی، اپنی مرضی اور خوشی سے، صرف ایک "ہاؤس وائف" کے طور پر زندگی گزارنا چاہتی ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ ڈمپل اب صرف اس لئے فلموں میں کام شروع نہیں کر رہی تھیں کہ انہیں معلوم تھا، اس بات پر راجیش دل ہی دل میں اور بھی زیادہ خفا ہوں گے اور ان کی ازدواجی زندگی میں مزید تلخی آ جائے گی۔ راجیش کا سسرال بھی ان سے اس حد تک بدظن ہو چکا تھا کہ اب ان کی گھریلو ناچاقی کی خبریں خود ان کے سسر چنی لال، پریس والوں کو فراہم کیا کرتے تھے۔

صحافیوں نے کوڈ ورڈز میں ان کا نام CIB رکھ دیا تھا، جس سے مراد تھی "چنی لال انفارمیشن بیورو" ڈمپل ہر دوسرے مہینے ناراض ہو کر بچیوں کو ساتھ لے کر میکے چلی جاتیں لیکن چند دن بعد لوٹ آتیں۔ بعض اخبار والوں کو تو یہ بھی شک ہوتا کہ یہ کہیں "پبلسٹی اسٹنٹ" یعنی خبروں میں رہنے کا بہانہ تو نہیں؟ راجیش کھنہ اس موضوع پر زبان سختی سے بند رکھتے۔ ایک بار ایک صحافی خاتون کے اصرار پر انہوں نے صرف اتنا کہا "کسی کو اپنا دکھ درد بتانے کا کیا فائدہ؟ دنیا والوں کے لئے آپ کے دکھ، ہنسی کا سامان ہوتے ہیں۔ اس لئے دنیا خواہ مجھ پر سنگ باری کرتی رہے لیکن میں اس کے جواب میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔"

ایک طرف راجیش کا کیریئر زوال کا شکار تھا، دوسری طرف گھریلو زندگی لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔

راجیش ان دکھوں کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کرتے، مگر اس طرح شاید ان کی اذیت کچھ اور بڑھ جاتی۔ ایک بار رات کے تین بجے وہ اپنی کاک ٹیل پارٹی سے فارغ ہونے کے بعد ٹیرس پر تنہا بیٹھے تھے کہ ان پر نشے اور دکھ کا کچھ ایسا غلبہ ہوا کہ وہ کھڑے ہو کر، دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر چیخ کر، پھٹی پھٹی سی، بلند آواز میں کہنے لگے "پروردگار! ہم غریبوں کا اتنا سخت امتحان نہ لے کہ ہم بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ جائیں..."

ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ ڈمپل کپاڈیا اور ان کے ملازمین بھی دوڑے دوڑے ٹیرس پر آ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ راجیش بلک بلک کر رو رہے تھے اور انہوں نے راجیش کی جیسی دردناک آواز اس رات سنی تھی، ویسی کبھی کسی فلم میں نہیں سنی تھی۔ ان دنوں راجیش کی، اوپر تلے سات فلمیں فلاپ ہو چکی تھیں۔ بڑی مشکل سے ڈمپل اور ملازمین نے انہیں چپ کرایا اور بیڈ روم میں لے کر آئے، راجیش خود بھی اپنی زندگی کی اس رات کو کبھی نہیں بھولے۔

ایک بار تو بہت زیادہ ڈپریشن کے عالم میں وہ خودکشی کے ارادے سے سمندر میں چلتے ہوئے، خاصی دور تک، گہرے پانی میں چلے گئے لیکن جب پانی ان کی ٹھوڑی تک پہنچا تو ان کی ذہنی رو پلٹ گئی۔ انہیں خیال آیا کہ انہیں ایک ناکام آدمی کی حیثیت سے نہیں مرنا چاہئے، یہ بزدلی کی علامت ہو گی۔ وہ سمندر سے لوٹ آئے۔ اگر ان دنوں ان کے آس پاس ان کا کوئی مخلص دوست، کوئی سمجھدار آدمی موجود ہوتا تو شاید وہ انہیں سمجھا بجھا کر ناکامیوں سے سمجھوتا کرنا سکھا دیتا لیکن اپنے اچھے دوستوں کو وہ خود ہی اپنے آپ سے دور کر چکے تھے، وہ بالکل تنہا ہو چکے تھے۔ ان کے پرستار بھی انہیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ دوسرے ہیروز کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ راجیش اس حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ زندگی بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہے، زندگی صرف کامیابیوں کا نام نہیں، اس میں ایک رنگ ناکامیوں کا بھی ہوتا ہے... اور کبھی کبھی تو ناکامیاں آپ کے ساتھ بہت دور تک چلتی ہیں۔

پروڈیوسر، ڈائریکٹر ساون کمار، راجیش کھنہ کے بہت بڑے مداح تھے۔ وہ نو سال تک کوشش کرتے رہے کہ راجیش کھنہ کو ہیرو لے کر فلم بنائیں لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ وہ جب بھی راجیش سے بات کرتے تو جواب ملتا "یار! میری ڈیٹس کی ڈائری پوری بھری ہوئی ہے، میں تمہیں کہاں سے ڈیٹس دوں؟"

ساون کمار کو کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا کہ شاید راجیش کھنہ ان کے ساتھ کام کرنا ہی نہیں چاہتے۔ آخرکار انہوں نے مایوس ہو کر کافی عرصہ پہلے راجیش کھنہ کو اس سلسلے میں فون کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ایک روز ساون کے فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی "ساون! اب میری ڈیٹس کی ڈائری بالکل خالی ہے، تم آ جاؤ... اور جو بھی ڈیٹس چاہئیں، وہ لے لو۔"

ساون کمار ایک لمحے تک تو کچھ بول نہیں سکے کیونکہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ دوسری طرف جو شخص بول رہا تھا، وہ راجیش کھنہ تھا...! (جاری ہے)

ٹینا مُنیم سے بھی اُن کا
معاشقہ شروع ہوگیا

قسط:17

جب ساون کمار کو معلوم ہوا کہ فون پر دوسری طرف راجیش کھنہ تھے، تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اب بھی راجیش کھنہ کو اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کے خواہشمند تھے۔ راجیش کھنہ کے بلاوے پر وہ ان کے گھر پہنچے تو راجیش بہت گرمجوشی سے ان سے ملے اور انہوں نے اپنی ڈیٹس کی ڈائری نکال کر ساون کمار کے سامنے رکھتے ہوئے کہا ”اس کے سارے صفحے سادہ پڑے ہیں۔ تمہیں جتنی ڈیٹس چاہئیں، وہ اس میں لکھ لو۔“

ساون کمار نے فلم کی کہانی انہیں سنائی اور جو ڈیٹس درکار تھیں، وہ لے لیں۔ اس فلم کا نام ”سوتن“ رکھا گیا تھا! ہیروئن کے لیے پدمنی کولہاپوری، زینت امان اور پروین بابی سے رجوع کیا لیکن تینوں میں سے کسی سے بات نہ بن سکی۔ آخر میں ٹینا منیم کو سائن کیا گیا۔ فلم کے ایک گانے کا مکھڑا ساون کمار نے خود لکھا تھا جو یوں تھا ”شاید میری شادی کا خیال دل میں آیا ہے، اس لئے ممّی نے میری تجھے چائے پہ بلایا ہے۔“

یہ گانا راجیش کھنہ پر پکچرائز ہونا تھا۔ یہ بول سن کر راجیش نے اپنی مخصوص اور مشہور زمانہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساون کمار سے کہا ”یار! میں اس عمر میں یہ گانا پکچرائز کراتا اچھا لگوں گا؟ میں دو بچیوں کا باپ ہوں۔“

ساون کمار نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا ”آپ اس کی فکر چھوڑیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ گانا آپ پر پکچرائز ہو گا تو ضرور ہٹ ہو گا۔“

اس فلم کو پبلسٹی دینے کے لیے اس کی شوٹنگ کے دوران ایک مشہور فلمی ماہنامے کے لیے راجیش اور ٹینا منیم کے ایک خصوصی فوٹو شوٹ کا پروگرام بنایا گیا۔ طے پایا کہ یہ فوٹو شوٹ راجیش کھنہ کے بنگلے ”آشیرواد“ میں ہو گا۔ ساون کمار نے سن رکھا تھا کہ راجیش کھنہ گھر پر ریشمی دھوتی اور کُرتا پہنتے ہیں۔ چنانچہ اس فوٹو شوٹ میں دھوتی اور کُرتا استعمال کیا گیا لیکن وہ اس طرح کہ راجیش کے جسم پر صرف دھوتی اور ٹینا منیم کے جسم پر کُرتا دکھایا گیا۔ ٹینا سرخ، ریشمی کُرتے اور راجیش سبز ریشمی دھوتی میں رسالے کے ٹائٹل پر بے حد خوبصورت اور منفرد دکھائی دیئے۔ ساون کمار کو اس بات پر حیرت تھی کہ راجیش نہایت آسانی سے اس قسم کی فرمائشوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتے جا رہے تھے۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ لوگوں نے خواہ مخواہ ہی مشہور کر رکھا تھا کہ راجیش کھنہ کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل ہے۔ ساون کمار کو نہیں معلوم تھا کہ ان کی یہ خوش فہمی مستقبل قریب میں دور ہونے والی تھی۔

”سوتن“ بولی وڈ کی پہلی فلم تھی جس کی شوٹنگ موریشس میں ہونی تھی۔ پہلے شوٹنگ کے انتظامات کیے گئے۔ پھر راجیش کھنہ، ڈمپل کپاڈیا، ٹینا منیم، پران اور پریم چوپڑا کو موریشس لے جایا گیا۔ ساون کمار بہت خوش تھے کہ نہایت ہموار انداز میں سارے کام ہوتے جا رہے تھے اور راجیش کھنہ کو ہینڈل کرنا تو قطعی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ راجیش کھنہ کے ساتھ ایک رائٹر بھی موریشس آیا تھا لیکن وہ رائٹر کم اور راجیش کا چمچہ زیادہ تھا۔

موریشس میں یہ سب لوگ سرکاری مہمان تھے اور انہیں ایک سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں قیام کی پہلی رات ہی راجیش کھنہ کی اپنے درباری رائٹر کے ساتھ پینے پلانے کی محفل جم گئی جو صبح چار بجے تک جاری رہی۔ اس کے بعد راجیش کھنہ نے ڈرائیور کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ کھانا کھانے کے لیے انہیں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لے چلے۔ درحقیقت دو پولیس انسپکٹرز کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ فلم یونٹ کے لیے بوقت ضرورت ڈرائیور کے فرائض انجام دیں۔ وہ سادہ لباس میں یہ ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ ایک ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں راجیش کھنہ کو بتایا کہ موریشس میں رات بارہ بجے سے لے کر صبح چھ بجے تک تمام ریسٹورنٹس، دکانیں اور بازار وغیرہ بند رہتے ہیں۔

راجیش کھنہ ڈرائیور پر چیخنے لگے ”تم بہانے بازی کر رہے ہو۔ ہمیں لے جانے سے انکار کر رہے ہو۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟“

راجیش کھنہ کا انداز بہت ہی توہین آمیز تھا جس کی وجہ سے ڈرائیور نے، جو دراصل ڈرائیور نہیں، بلکہ پولیس انسپکٹر تھا، بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔ راجیش نشے میں دُھت تھے۔ انہوں نے اسے بھی گالیاں دیں، پھر ساون کمار کو بھی گالیاں دیں کہ اس نے کیسے بے ہودہ انتظامات کیے تھے۔ ساون کمار ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی راجیش کھنہ تھے جن سے وہ اتنے دنوں سے مل رہے تھے۔ گرما گرمی کے دوران ایک لمحہ ایسا آیا جب ساون کمار نے راجیش کھنہ سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس دوران اداکار پران وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بڑی مشکلوں سے معاملہ رفع دفع کرایا۔

دوسرے روز شوٹنگ پر راجیش کھنہ اس طرح ساون کمار سے ملے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دو تین دن کی شوٹنگ کے دوران راجیش کھنہ نے محسوس کر لیا کہ ساون کمار کچھ کھنچے کھنچے سے ہیں۔ انہوں نے ساون کو گلے سے لگا لیا اور بڑی اپنائیت سے بولے ”ارے یار... تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہو!“

ساون کمار حیرت سے ان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔ تاہم انہوں نے بھی رنجش اپنے دل سے نکال دی۔

ٹینا منیم ایک عرصے سے راجیش کی پرستار تھیں۔ ”سوتن“ کی شوٹنگ کے دوران ٹینا اور راجیش کے درمیان غیر معمولی کیمسٹری دیکھ کر ڈمپل پریشان ہو گئیں۔ ان کی چھٹی حس انہیں ایک خاص خطرے کا احساس دلانے لگی۔ ان کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ موریشس میں فلم کی شوٹنگ کے دوران ٹینا اور راجیش کے درمیان معاشقہ شروع ہو گیا۔ یہ معاشقہ ڈمپل کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انہوں نے اس کا بہت زیادہ اثر لیا۔

ایک روز راجیش کھنہ شوٹنگ سے واپس اپنے ہوٹل کے کمرے میں آئے تو ان کی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر لپ اسٹک سے لکھا تھا ”میں آپ سے محبت کرتی ہوں لیکن... خدا حافظ“

ڈمپل انڈیا واپس جا چکی تھیں۔ اس کے بعد وہ کبھی ”آشیرواد“ واپس نہیں آئیں۔ راجیش اور ڈمپل کی نو سالہ ازدواجی زندگی یوں انجام کو پہنچ گئی۔ ساون کمار کو ہمیشہ افسوس رہا کہ راجیش اور ڈمپل کے درمیان علیحدگی ان کی فلم کی شوٹنگ کے دوران ہوئی۔ سننے میں آیا کہ اس کے بعد ٹینا منیم ہی ”آشیرواد“ میں رہنے لگی تھیں لیکن گھر سے باہر کے کسی آدمی نے ٹینا کو وہاں رہتے نہیں دیکھا۔ کسی اور ذریعے سے بھی اس بات کی باقاعدہ تصدیق نہیں ہو سکی۔ راجیش کھنہ کو بیٹیوں کے پیدا ہونے پر خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن بعد میں وہ ان سے بہت پیار کرنے لگے تھے۔

ڈمپل کے جانے کے بعد راجیش بچیوں کو یاد کر کے بہت زیادہ اُداس ہو جاتے۔ ان کے پاس ہر دکھ درد کا ایک ہی علاج تھا۔ یعنی وہ پینے بیٹھ جاتے تھے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ خوشی منانے کے لیے بھی شراب پیتے تھے اور دُکھ بھلانے کے لیے بھی۔ سننے میں آیا ہے کہ ایک روز انہوں نے اپنی اسی کیفیت میں ڈمپل کو فون کر کے کہا ”رشتہ توڑا ہے... دوستی مت توڑنا۔“

وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ڈمپل سے علیحدگی کے ذمّے دار وہ خود تھے اور غلطی انہی کی تھی!

ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ان کی فلم ”سوتن“ سپرہٹ ہو گئی اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کی مزید تین فلمیں ”اوتار“ ”اگر تم نہ ہوتے“ اور ”ڈسکو ڈانسر“ بھی کامیاب ہو گئیں۔ 1980ء کی دہائی میں ان چار فلموں کی کامیابی نے انہیں گویا پھر پہلا سا راجیش کھنہ بنا دیا۔ ان کے عروج کا دور لوٹ آیا۔ وہ خوش بھی تھے اور حیران بھی۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا ”جب میرا بُرا دور چل رہا تھا تو کچھ لوگ میری فلموں کی ناکامی کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ میں خراب اداکاری کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ میں اپنی خراب عادتوں اور بد مزاجی کی وجہ سے ایک ناکام آدمی ہوں... لیکن میں تو اب بھی وہی راجیش کھنہ ہوں، نہ میری اداکاری بدلی ہے اور نہ میری عادتیں... مگر میں ایک بار پھر کامیاب ہوں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان وہی رہتا ہے۔ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں، وقت بدلتا رہتا ہے۔“

ٹینا منیم سے اپنے تعلقات کا اب وہ بلا جھجک اعتراف کرتے تھے۔ ایک خاتون صحافی نے ان سے پوچھا کہ وہ اور ٹینا منیم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں یا ان کے درمیان کتنی ہم آہنگی ہے، تو اس کے جواب میں راجیش کھنہ نے کہا ”اس کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ میں اور ٹینا ایک ہی ٹوتھ برش سے دانت صاف کرتے ہیں۔“

اپنی فلم ”اوتار“ پر وہ بہترین اداکار کی کیٹگری میں فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد بھی ہوئے لیکن انہیں ایوارڈ ملا نہیں۔ تاہم تقریباً بیس سال بعد اسی کہانی پر دوبارہ ”باغباں“ کے نام سے فلم بنائی گئی تو امیتابھ بچن نے وہی رول کیا جو ”اوتار“ میں راجیش کھنہ نے کیا تھا، تو امیتابھ بچن کو ایوارڈ مل گیا۔ دونوں اداکاروں کی، اپنے عروج کے زمانے میں زبردست مقابلے بازی، بلکہ رقابت رہی۔ ان کی مقابلے بازی دوستانہ یا صحت مندانہ نہیں تھی جیسی کہ دیو آنند، دلیپ کمار اور راج کپور کے درمیان ہوتی تھی۔

امیتابھ کے بارے میں راجیش اس قسم کے تبصرے کرنے سے باز نہیں رہتے تھے جو ان کے اندرونی حسد کی نشاندہی کرتے تھے۔ مثلاً فلم ”شکتی“ میں امیتابھ بچن، دلیپ کمار کے ساتھ آئے اور فلم کامیاب ہوئی تو راجیش نے کہا ”بھئی واہ! ہمیں تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس عمر میں بھی دلیپ صاحب کو اتنا پسند کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے فلم ہِٹ ہو سکتی ہے!“

گویا انہوں نے فلم کی کامیابی کا سارا کریڈٹ یوں دلیپ صاحب کو دے دیا جیسے امیتابھ اس میں تھے ہی نہیں۔ اسی طرح ایک بار امیتابھ کے ڈسپلن اور ذمّے دارانہ رویے کا کسی نے راجیش کھنہ کی غیر ذمّے داری اور نخرے بازیوں سے موازنہ کیا تو راجیش نخوت سے بولے ”کلرک ڈسپلن کے پابند ہوتے ہیں۔ میں کلرک نہیں، فنکار ہوں۔“

راجیش کے اس قسم کے تبصرے پریس میں بھی آتے رہتے تھے لیکن امیتابھ نے کبھی ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ سیاستدان امر سنگھ جو کسی زمانے میں امیتابھ بچن کے بہت قریب تھے، انہوں نے امیتابھ بچن کے اس رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ”انسانوں میں حسد اور رقابت ایک فطری جذبہ ہے۔ زیادہ تر انسان جب کسی سے حسد کرتے ہیں، تو اس کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ بولتے ہیں۔ یہ فطری اور عام سی بات ہے لیکن دوسرا جب اس کے جواب میں کچھ نہ بولے تو یہ اس شخص کے لیے زیادہ توہین کی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص نے آپ کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی، آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ آپ کے بارے میں کوئی تبصرہ کیا جائے، آپ کا ہونا، نہ ہونا اس کی نظر میں ایک برابر ہے۔ امیتابھ بچن نے یہ اصول اپنایا ہوا تھا۔ یہ ان کے رقیبوں اور حاسدوں کے لیے زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ توہین کا باعث تھا۔ (جاری ہے)

ڈمپل اپنے ہیرو
سنی دیول سے
پینگیں بڑھانے لگیں

1984ء سے 1985ء کے دوران، یعنی دو سال سے بھی کم عرصے میں راجیش کھنہ کی 19، فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں سے زیادہ تر فلاپ ہو گئیں۔ اوپر سے اس دوران وی سی آر عام ہو گیا تھا اور فلمیں گھر گھر پہنچنے لگی تھیں جس کی وجہ سے فلم بزنس متاثر ہو رہا تھا۔ راجیش کھنہ کو شاید پروڈیوسرز کے کروڑوں روپے ڈبو کر اطمینان نہیں ہوا تھا، اس لئے انہوں نے خود اپنی فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے ایک فلم کا اعلان کر دیا جس کے ہیرو بھی وہ خود تھے اور پروڈیوسر بھی۔ فلم کا نام تھا ”الگ الگ۔“

ٹینا منیم اس فلم کی ہیروئن تھیں اور اپنے پرانے دوست شکتی سامنتا کو راجیش نے ڈائریکٹر کے فرائض سونپے۔ تاہم پہلے شاٹ کیلئے ڈائریکٹر کا کام لیش چوپڑا نے سنبھالا۔ ٹوئنکل کھنہ نے پہلے شاٹ کیلئے کلیپ دی۔ یہ فلم بڑے اہتمام سے بنی لیکن بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اس کے ساتھ نہ صرف راجیش کھنہ کا بہت سا پیسہ ڈوبا بلکہ فلم انڈسٹری میں ان کی ساکھ بھی متاثر ہوئی۔ ٹینا منیم کے ساتھ ان کی جوڑی صرف ”سوتن“ میں کامیاب رہی تھی لیکن اپنی فلم میں ٹینا کے ساتھ جوڑی بنانے کا بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس سے پہلے بھی ٹینا کے ساتھ ان کی تین فلمیں فلاپ ہو چکی تھیں۔

ایک طرف فلموں میں ان کی جوڑی فلاپ ہو رہی تھی اور دوسری طرف حقیقی زندگی میں ان کے ساتھ جوڑی بنانے کیلئے ٹینا کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے درمیان تعلقات تو چلے آ رہے تھے لیکن ٹینا اب شادی پر زور دے رہی تھی۔ اسی دوران ڈمپل کی، فلموں میں واپسی کی خبریں گرم تھیں۔ گو کہ راجیش اور ڈمپل کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی، اس کے باوجود راجیش کھنہ، ڈمپل کے فلموں میں آنے کی خبریں سن کر سیخ پا تھے۔ انہی دنوں ”ساگر“ کے نام سے ایک فلم کا اعلان ہو گیا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ اس فلم کے اشتہاروں میں اس بات کو بہت نمایاں کیا جا رہا تھا کہ ”بوبی“ کی کامیاب جوڑی ہی اس میں مرکزی کردار ادا کرے گی، یعنی رشی کپور اور ڈمپل کپاڈیا اس فلم کے ہیرو، ہیروئن ہوں گے۔ ایک باخبر فلمی صحافی خاتون نے ان دنوں اپنے کالم میں لکھا، اس فلم کی شوٹنگ باقاعدہ طور پر شروع ہونے سے پہلے بے چارے رشی کپور، راجیش کھنہ سے آشیرواد لینے ان کے بنگلے ”آشیرواد“ گئے لیکن وہاں سے ان کو آشیرواد کے بجائے تقریباً دھکے ملے۔ وہ جب راجیش کھنہ کے کمرے میں پہنچے تو پہلے راجیش کھنہ نے انہیں کھری کھری سنائیں پھر اپنے سیکرٹری کو بلا کر کہا کہ انہیں باہر کا راستہ دکھاؤ۔

بہرحال، راجیش جلتے، کڑھتے اور چیختے چلاتے ہی رہ گئے اور ڈمپل نہایت دھوم دھام سے فلموں میں واپس آ گئیں۔ ”ساگر“ کے بعد بھی انہوں نے کئی فلمیں سائن کیں جن میں سے دو میں سنی دیول ان کے ہیرو تھے۔ جو اداکار بھی ڈمپل کے ساتھ ہیرو آتا تھا، اس کے بارے میں راجیش اپنے ملازمین کو حکم دے دیتے تھے کہ وہ کبھی ان کے گھر ”آشیرواد“ میں داخل نہ ہونے پائے۔ اس دوران وہ خود ٹینا منیم کے بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے جس کی تزئین اور آرائش نو پر انہوں نے بھاری رقم خرچ کی تھی اور اسے اپنے مزاج اور مطلوبہ معیار کے مطابق بنوا لیا تھا۔

ادھر راجیش کھنہ، ڈمپل کپاڈیا کے، فلموں میں کام کرنے پر جل کڑھ رہے تھے، ادھر ڈمپل کا اپنے ایک ہیرو سنی دیول کے ساتھ معاشقہ شروع ہو گیا۔ سنی دیول بھی پہلے سے شادی شدہ تھے لیکن وہ تھوڑے ہی عرصے میں ڈمپل کے اتنا قریب آ گئے تھے اور اتنا وقت ان کے ساتھ گزارنے لگے تھے کہ ڈمپل کی دونوں بچیاں ٹوئنکل اور رنکی انہیں ”چھوٹے پاپا“ کہنے لگی تھیں۔ سنی دیول بھی ان بچیوں کے ”قائم مقام پاپا“ بن کر اتنے خوش تھے کہ انہوں نے ڈمپل کی چھوٹی بہن سمپل کپاڈیا کو اپنی ڈریس ڈیزائنر بنا لیا۔ چنانچہ پروڈیوسرز پر یہ نئی مصیبت آن پڑی کہ اگر وہ سنی دیول کو کاسٹ کرتے تو گویا ڈمپل اور سمپل خود بخود ہی ”پیکیج“ میں شامل ہو جاتیں اور پروڈیوسرز کو ان کے بھی بہت سے اخراجات برداشت کرنے پڑتے۔

بھورے بالوں والی خوبصورت ڈمپل کپاڈیا اور زوال پذیر راجیش کھنہ کے درمیان طلاق اس لئے نہیں ہو پا رہی تھی کہ ڈمپل اپنی دونوں بچیوں کی کفالت کیلئے راجیش کھنہ سے اچھی خاصی رقم کا مطالبہ کر رہی تھیں جس سے راجیش بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ڈمپل طلاق کے کاغذات پر دستخط نہیں کر رہی تھیں۔ ممکن ہے راجیش کھنہ اس لئے بھی طلاق کی کارروائی مکمل کرنے سے کترا رہے ہوں کہ اس کے بعد ان کی دونوں بیٹیاں ”چھوٹے پاپا“ کے پاس چلی جائیں گی۔ بیٹیوں سے بہرحال وہ پیار کرتے تھے۔

اب صورتحال یہ تھی کہ راجیش اور ڈمپل کے درمیان طلاق نہیں ہو پا رہی تھی، ٹینا منیم سے راجیش شادی نہیں کر پا رہے تھے اور شادی کیلئے ٹینا منیم کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ راجیش خود مانتے تھے کہ ٹینا نے ان سے کچھ اس طرح محبت کی تھی کہ بچپن سے لے کر اب تک زندگی نے جو زخم ان کے دل پر لگائے تھے، وہ سب ٹینا نے بھر دیئے تھے لیکن شادی پر اس کا اصرار گویا ایک نئی پریشانی تھی جس کا راجیش کو سامنا تھا۔ سال پر سال گزرتے جا رہے تھے۔ یہ تناؤ بڑھتا گیا اور آخر کار تعلق کی یہ ڈور ٹوٹ گئی۔ ”سوتن“ کے ڈائریکٹر ساون کمار اس دوران ایک اور فلم ”سوتن کی بیٹی“ کا پروگرام بنا چکے تھے۔ انہوں نے راجیش اور ٹینا کو ہیرو، ہیروئن کے طور پر سائن کیا تھا اور کچھ شوٹنگ بھی کر لی تھی جس کے بعد راجیش اور ٹینا کے درمیان ترک تعلق ہو گیا۔ راجیش نے ٹینا کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ساون کمار کے خیال میں اب ان دونوں سے ایک ہی فلم کے سیٹ پر اکٹھے کام لینا ممکن بھی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اس وقت تک کی شوٹنگ پر خرچ ہونے والی تیرہ لاکھ روپے کی رقم پر صبر کر لیا اور جیتندر اور جیا پرادا کو لے کر نئے سرے سے فلم کی شوٹنگ شروع کی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راجیش کھنہ ان دنوں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے تین محبتیں کی تھیں اور تینوں عورتیں انہیں چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ ان کی تین محبتیں ناکام ہوئی تھیں، صدمہ بلاشبہ شدید تھا لیکن انڈیا کی ایک معروف سماجی شخصیت، صحافی، مصنفہ اور ٹی وی میزبان شوبھاڈے کہتی ہیں کہ میں نے ایک بار ٹینا منیم سے پوچھا کہ کیا راجیش کھنہ واقعی ان سے محبت کرتے تھے؟ اس پر ٹینا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا تھا۔ ”کاکا جی کسی سے پیار نہیں کر سکتے... ان میں کسی سے پیار کرنے کی اہلیت ہی نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے آپ سے پیار کرتے ہیں۔“

مشہور پروڈیوسر اور ڈائریکٹر مہیش بھٹ کے خیال میں راجیش کھنہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی طرح تھے جن کے ہاتھوں سے عملی طور پر ہندوستان کا اقتدار نہ جانے کب کا جا چکا تھا لیکن انہیں شاید زندگی کے آخری ایام میں بھی پوری طرح اس بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

1980ء کی دھائی میں انڈین فلم انڈسٹری ایک انقلاب سے گزر رہی تھی۔ فلموں کے انداز، موضوعات، فلمی دنیا کے لوگوں کے طور طریقے، سبھی کچھ تبدیل ہو رہا تھا۔ انیل کپور، سنی دیول، سنجے دت، جیکی شروف جیسے نئے باصلاحیت اداکار فلم انڈسٹری میں قدم جما چکے تھے۔ پھر 1988ء میں ”قیامت سے قیامت تک“ کے ذریعے عامر خان ایک رومانی ہیرو کے طور پر متعارف ہوئے۔ یہ فلم ناصر حسین نے پروڈیوس کی تھی جنہوں نے تقریباً بیس سال پہلے اپنی ایک ابتدائی دور کی فلم ”بہاروں کے سپنے“ میں راجیش کھنہ کو بھی کاسٹ کیا تھا۔ عامر خان کے بعد 1989ء میں رائٹر سلیم خان کے صاحبزادے سلمان خان بھی ”میں نے پیار کیا“ کے ذریعے بھرپور انداز میں فلمی شائقین کے سامنے آ گئے۔

نئے ستاروں کی اس کہکشاں کے سامنے تو راجیش کھنہ کا نام اور کام بالکل ہی دھندلا گیا۔ وقت کے اس تغیر نے دھیرے دھیرے راجیش کھنہ کے اندر بھی ایک انقلاب برپا کر دیا۔ شاید وہ حقیقت پسند ہو گئے یا پھر انہیں احساس ہوا کہ انہیں صرف ناکامی اور زوال ہی کا نہیں بلکہ نہایت تکلیف دہ تنہائی کا بھی سامنا ہے۔ شاید ایسے ہی کسی لمحے میں انہوں نے اپنی پرانی اور فراموش کردہ محبوبہ انجو مہندرو کو فون کر ڈالا۔ دونوں کے درمیان کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی، کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوا۔

راجیش کھنہ نے صرف اتنا پوچھا۔ ”کیا میں آج شام تم سے ملنے آ سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ دوسری طرف سے بلا ہچکچاہٹ جواب ملا۔

اسی شام راجیش کھنہ کی گاڑی انجو مہندرو کے اسی بنگلے کے سامنے کھڑی تھی جو راجیش نے ہی انہیں تحفے کے طور پر دیا تھا۔ اس گھر کے دروازے بھی راجیش کھنہ کیلئے کھلے تھے اور انجو مہندرو کی بانہیں بھی...! انجو نے راجیش کے پسندیدہ مشروب سے ان کی تواضع کی۔ باتیں شروع ہوئیں تو بس پھر ہوتی ہی چلی گئیں۔ وقت کی ڈور گویا وہیں سے جڑ گئی جہاں سے ٹوٹی تھی۔ 17، سال کی جدائی بیچ میں سے غائب ہو چکی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے غالباً ڈمپل کپاڈیا سے بھی تجدید تعلق کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کیلئے وہ اپنی اصل حیثیت میں ڈمپل کے پاس جانے کے بجائے فلم پروڈیوسر بن گئے۔ انہوں نے ”جے شیو شنکر“ کے نام سے ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ہیرو وہ خود تھے۔ ہیروئن کیلئے وہ ڈمپل کو سائن کرنے چلے گئے جس نے انکار نہیں کیا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس فلم میں بھرپور اظہار محبت کے بھی کئی سین تھے۔ یہ فلم مکمل تو ہوئی لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر ریلیز نہیں ہوئی۔

بعد میں ایک انٹرویو میں راجیش کھنہ نے کہا۔ ”مجھے اپنی بیوی کے فلموں میں کام کرنے پر کبھی کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن شادی کے فوراً بعد وہ گھرداری میں لگ گئی اور پھر ”بوبی“ کی ریلیز سے پہلے ہی وہ امید سے تھی۔ میں نے تو جب اسے اپنی فلم کیلئے کام کرتے دیکھا تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی زبردست اداکارانہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ کسی میں اگر اتنی صلاحیتیں موجود ہوں تو انہیں ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے بعد تو میں نے اپنی بیٹی ٹوئنکل سے بھی کہا کہ اگر تمہارے خون میں بھی اداکاری کے جراثیم موجود ہوں تو تم ضرور اپنے اس شوق کی تکمیل کرنا۔ اگر کوئی اور تمہیں اپنی فلم میں کاسٹ نہیں کرے گا تو میں خود تمہارے لئے فلم بناؤں گا۔“

بعض فلمی صحافیوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ ڈمپل کو فلم میں کاسٹ کر کے اور خود ان کے مقابل ہیرو بن کر در اصل راجیش نے اپنے گرتے ہوئے کیریئر کو سہارا دینے کی کوشش کی تھی کیونکہ بھورے بالوں والی، خوبصورت، خوش ادا ڈمپل کپاڈیا ان دنوں راجیش سے زیادہ خبروں میں رہتی تھی۔ اس کی خوبصورت اور رنگارنگ تصویریں اخباروں، رسالوں میں زیادہ چھپتی تھیں۔ جب راجیش نے انہیں اپنے مقابل ہیروئن لینے کا اعلان کیا تو ان دونوں کے مشترکہ انٹرویوز اور تصویریں ادھر ادھر چھپنے لگیں۔

اس صورتحال میں 1990ء میں ایک مشہور فلمی رسالے ”مووی“ کے ایڈیٹر دنیش اور ان کی ایک سینئر صحافی ساتھی نینا اروڑا نے فیصلہ کیا کہ جب راجیش کھنہ اور ڈمپل کپاڈیا دوبارہ اکٹھے ہو سکتے ہیں اور ان کے مشترکہ انٹرویو چھپ سکتے ہیں تو کیوں نہ امیتابھ بچن اور راجیش کھنہ کا بھی مشترکہ انٹرویو کیا جائے۔ پوری فلم انڈسٹری کو معلوم تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آنا اور ایک دوسرے سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے۔ (جاری ہے)

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات
انہوں نے گویا اپنا دل کھول کر
امیتابھ بچن کے سامنے رکھ دیا

راجیش کھنہ کی داستان حیات

قسط:19

بہر حال مشترکہ انٹرویو کیلئے کوششیں شروع ہوئیں تو حیرت انگیز طور پر دونوں سپر اسٹارز نے ہامی بھر لی۔ایک شاندار ہوٹل میں ملاقات طے پائی۔اب ونیش اور نینا کو یہ تشویش ہوئی کہ امیتابھ بچن تو وقت کے پابند تھے۔دونوں صحافیوں کو امید تھی کہ امیتابھ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے لیکن راجیش کھنہ کو کبھی وقت پر پہنچتے نہیں دیکھا گیا تھا۔امیتابھ انہیں لیٹ ہوتے دیکھ کر برا منا کر انٹرویو دیئے بغیر واپس بھی جا سکتے تھے کیونکہ اب ان کا مقام و مرتبہ اور اہمیت راجیش کھنہ سے بھی زیادہ تھی۔

اسی ادھیڑ بُن میں مقررہ دن آپہنچا۔دونوں صحافی مقررہ وقت سے پہلے ہوٹل میں موجود تھے اور اندیشوں سے دونوں کے دل دھڑک رہے تھے کہ انہوں نے ایک غیر معمولی انٹرویو کا پروگرام تو بنا لیا تھا لیکن اس کا انجام نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ان کی توقع کے مطابق امیتابھ بچن تو مسکراتے ہوئے عین مقررہ وقت پر ہوٹل کے ایک دروازے سے اندر آتے دکھائی دے گئے لیکن راجیش کھنہ کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

امیتابھ بچن دروازے سے داخل ہونے کے بعد دو چار قدم ہی آگے آئے تھے کہ ان کے مقابل دوسرا دروازہ کھلا اور راجیش کھنہ آتے دکھائی دیئے۔دونوں سپر اسٹارز آمنے سامنے کے دروازوں سے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئے تھے اور اب ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔راجیش کھنہ کا وقت پر آجانا دونوں صحافیوں، ونیش اور نینا کے لیے بے پناہ حیرت کا باعث تھا لیکن ابھی اس سے بھی بڑی حیرت ان کی منتظر تھی۔انہوں نے دیکھا کہ دونوں فنکار ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر گلے ملے۔پھر انہوں نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔دونوں صحافی جو لابی میں کچھ دور بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے، انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

جب دونوں سپر اسٹارز ایک دوسرے سے مل چکے اور کچھ دیر آپس میں باتیں کر چکے تو ونیش اور نینا نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں اس کانفرنس روم میں لے گئے جہاں ان دونوں کا مشترکہ انٹرویو ہونا تھا۔دونوں صحافی اور دونوں سپر اسٹارز ایک میز پر بیٹھے۔پہلے خاطر مدارت کے لیے امیتابھ اور راجیش کھنہ کے اپنے اپنے پسندیدہ مشروب کا دور چلا۔پھر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ابتداء میں امیتابھ بچن کچھ مضطرب سے تھے جبکہ راجیش کھنہ روانی اور بے تکلفی سے، بے تحاشا باتیں کر رہے تھے۔

انٹرویو کے دوران کئی بار تو ایسا محسوس ہوا جیسے راجیش کھنہ، امیتابھ بچن کا انٹرویو لے رہے ہیں۔یہ ایک یادگار انٹرویو تھا۔وہی راجیش کھنہ جنہیں امیتابھ کا حریف ہی نہیں بلکہ تقریباً جانی دشمن سمجھا جاتا تھا، وہ امیتابھ سے اتنی اپنائیت، محبت اور جوش و خروش سے باتیں کر رہے تھے جیسے کوئی پُراشتیاق بچہ اپنی پسندیدہ ہستی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے اس سے سوال پر سوال کیے جا رہا ہو۔راجیش کھنہ نے اس دوران یہ اعتراف بھی کیا کہ شروع شروع میں وہ واقعی امیتابھ بچن سے حسد کا شکار تھے لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں تھی، اب تو وہ امیتابھ پر رشک کرتے تھے۔

اس وقت راجیش کھنہ کو فلمی دنیا میں قدم رکھے 17، برس گزر چکے تھے۔گویا سترہ برس میں وہ اس قابل ہوئے تھے کہ حقائق کو سمجھ سکیں، حقیقت پسندانہ انداز میں سوچ سکیں۔اب جا کر ان میں اتنی ذہنی پختگی آئی تھی کہ وہ اپنے سامنے بیٹھے اپنے سب سے بڑے حریف کے ساتھ خود اس کی اپنی ذات کے بارے میں کسی قسم کے حسد میں مبتلا ہوئے بغیر، متوازن انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔یکایک ہی راجیش کھنہ کی ذات میں گویا کوئی انقلاب آیا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ ونیش اور نینا نے انہیں آمنے سامنے بٹھا کر ایک بہت اچھا کام کیا تھا۔

راجیش کھنہ نے گویا اپنا دل کھول کر ونیش، نینا اور امیتابھ کے سامنے رکھ دیا تھا۔وہ بے ساختگی سے ہر بات کر رہے تھے جبکہ امیتابھ محتاط اور نپے تلے انداز میں بات کر رہے تھے۔یہ تفصیلی اور مشترکہ انٹرویو جب ”مووی“ (Movie) رسالے میں چھپا اور اس کے سرورق پر امیتابھ اور راجیش اکٹھے نظر آئے تو فلم انڈسٹری میں ہی نہیں بلکہ فلمی شائقین میں بھی تہلکہ مچ گیا۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راجیش اور امیتابھ ایک جگہ بیٹھ کر انٹرویو دے سکتے ہیں۔”مووی“ کے اس شمارے کی فروخت نے ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔اس شمارے کی اشاعت کے بعد ایک روز ڈائریکٹر، پروڈیوسر مہیش بھٹ کی ملاقات ونیش سے ہوئی تو وہ پُرجوش لہجے میں بولے۔”ونیش! تم نے ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔“

26، اپریل 1991ء کو انڈیا کے سرکاری ٹی وی چینل ”دوردرشن“ سے یہ خبر ٹیلی کاسٹ ہوئی کہ راجیش کھنہ نے ملک کے عام انتخابات میں حصہ لینے کے لیے دہلی کے حلقے سے کاغذات نامزدگی داخل کیے ہیں۔وہ جمعے کا دن تھا۔جمعہ اداکاروں کی زندگی میں اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ زیادہ تر فلمیں اسی دن ریلیز ہوتی ہیں۔راجیش کھنہ نے کاغذات نامزدگی بھی اسی دن داخل کیے تھے۔درحقیقت راجیو گاندھی نے راجیش کھنہ کو کانگریس میں شامل ہونے اور اسی جماعت کے پلیٹ فارم سے کاغذات نامزدگی داخل کرانے پر آمادہ کیا تھا۔

کانگریس کو ایسی مشہور شخصیات اور جانے پہچانے چہروں کی اشد ضرورت تھی جو ان کی انتخابی مہم میں اہم کردار ادا کر سکیں اور جن کے، الیکشن میں جیتنے کے امکانات بھی زیادہ ہوں، جس کے بعد وہ لوک سبھا کے ممبر بن سکتے تھے اور اگر وہ الیکشن نہ بھی جیت پاتے تو انہیں راجیہ سبھا کا ممبر بنوایا جا سکتا تھا جو درحقیقت انڈیا کی سینیٹ ہے۔راجیو گاندھی کی راجیش کھنہ سے اچھی دوستی تھی۔

ایک بار راجیش کھنہ نے راجیو گاندھی سے کہا۔”آپ تو خود اچھے خاصے سپر اسٹار دکھائی دیتے ہیں۔“

راجیو گاندھی ہنس دیئے اور بولے ”سپر اسٹار تو آپ ہیں، ہم تو صرف سیاستداں ہیں۔“

راجیش کھنہ کو الیکشن لڑنے کے لیے پارٹی نے ٹکٹ آخری وقت میں دیا تھا۔انہیں اسی روز انکار یا اقرار میں جواب دینا تھا، جب کاغذات نامزدگی جمع کرانے میں صرف ایک دن باقی تھا تاہم راجیش کھنہ اس بات سے پریشان نہیں ہوئے۔انہیں زندگی کے اکثر اہم فیصلے آخری لمحوں میں ہی کرنے پڑتے تھے۔دہلی کے اس حلقے سے راجیش کھنہ کا مقابلہ لال کرشنا ایڈوانی سے تھا جو بی جے پی کے ایک بڑے لیڈر تھے لیکن وزیراعظم نے راجیش کھنہ پر جس طرح اعتماد کا اظہار کیا تھا، اس کی وجہ سے وہ ایڈوانی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

وہ کچھ اس طرح پُرجوش تھے جیسے کسی فلم میں سیاسی لیڈر کا رول ملنے کے بعد انہیں حقیقی زندگی میں اس کی ریہرسل کرنے کا موقع مل رہا ہو۔باندرہ لنک روڈ پر راجیش کھنہ کا ذاتی دفتر جو عرصے سے ویران پڑا تھا، یکدم ہی آباد ہو گیا اور وہاں زبردست گہما گہمی دکھائی دینے لگی۔وہاں سیاسی عہدیداروں اور کارکنوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی جن کی خاطر مدارت کے لیے انجو مہندرو وہاں موجود تھیں۔راجیش ممبئی میں رہتے تھے اور دہلی سے الیکشن لڑنے جا رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ادھیڑ عمری میں آکر ایک نیا کیریئر شروع کرنے جا رہے ہوں۔

وہ دہلی آکر قیام پذیر ہو گئے تھے اور جلسے جلوسوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ان کا نام سن کر لوگ جلسوں میں کھنچے چلے آتے تھے۔ان میں زیادہ تعداد خواتین کی ہوتی تھی۔راجیش کھنہ کم بولتے تھے، مختصر تقریر کرتے تھے لیکن جب وہ بولتے تھے تو مجمع گویا سحر زدہ ہو کر سنتا تھا۔ان کی انتخابی مہم آگے بڑھی تو ڈمپل کپاڈیا، جن سے ان کی علیحدگی ہو چکی تھی اور ان کی بیٹی ٹونکل کھنہ بھی ان کی مدد کے لیے دہلی پہنچیں اور راجیش کھنہ کے ساتھ انہوں نے بھی کئی پریس کانفرنسوں سے خطاب کیا۔

20، مئی 1991ء کو دہلی کے لوگ ووٹ ڈالنے نکلے۔21، مئی کو انڈیا کے تقریباً ہر اخبار کے صفحہ اوّل پر ایک تصویر چھپی جس میں راجیو گاندھی اور سونیا گاندھی کو ووٹ ڈالتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔یہ ان دونوں کی اکٹھے چھپنے والی آخری تصویر تھی کیونکہ اسی رات تامل ناڈو کے ایک شہر میں راجیو گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔وہ انتخابی مہم کے سلسلے میں وہاں گئے تھے۔

ادھر دہلی میں جب یو پی سپریم کورٹ کی عمارت میں ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تو کسی کو امید نہیں تھی کہ ایل۔کے ایڈوانی جیسے قدآور سیاستدان کے مقابلے میں راجیش کھنہ جیت سکیں گے۔ایڈوانی کے کارکنوں نے تو جیت کا جشن منانے کے لیے ہار پھول وغیرہ پہلے سے منگوا کر رکھے ہوئے تھے لیکن جب ووٹوں کے ڈبے کھلنا شروع ہوئے تو دھڑا دھڑ راجیش کھنہ کے ووٹ برآمد ہونے لگے۔جب آدھے سے زیادہ پولنگ اسٹیشنز کے ووٹوں کی گنتی مکمل ہو گئی تو راجیش کھنہ کے ناتجربہ کار پولنگ ایجنٹس اور دیگر سیاسی کارکن گنتی کے عمل کی نگرانی چھوڑ کر، جیت کا جشن منانے کے لیے ہار پھول اور دوسرے لوازمات خریدنے کے لیے بازاروں کی طرف دوڑ پڑے۔راجیش کھنہ کا کوئی نمائندہ اس ہال میں موجود نہ رہا جہاں گنتی ہو رہی تھی۔کافی دیر بعد جب راجیش کھنہ کے ساتھی اپنی خریداری کر کے واپس آئے تو ایل۔کے ایڈوانی کے کیمپ سے فاتحانہ نعروں کی آوازیں آرہی تھیں۔پتا چلا کہ ایڈوانی 1500، ووٹوں سے جیت چکے ہیں۔راجیش کھنہ اپنی شکست پر تلملاتے اور شور مچاتے رہ گئے لیکن ان کی چیخ و پکار کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

ایڈوانی نے دو حلقوں سے الیکشن لڑا تھا۔دہلی کے علاوہ وہ گاندھی نگر سے بھی کھڑے ہوئے تھے۔دہلی میں وہ راجیش کھنہ کے مقابلے میں معمولی فرق سے جیتے تھے اور یہ فرق بھی مشکوک نظر آرہا تھا جبکہ گاندھی نگر میں وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے۔چنانچہ انہوں نے دہلی والی نشست چھوڑ دی اور گاندھی نگر کی نشست پر لوک سبھا میں جانے کا فیصلہ کیا جبکہ مجموعی طور پر ملک میں کانگریس جیت چکی تھی اور نرسمہا راؤ وزیراعظم بنے تھے۔دہلی میں ایڈوانی کی چھوڑی ہوئی سیٹ کے لیے ضمنی الیکشن ہوا تو اس کے لیے کانگریس نے ایک بار پھر راجیش کھنہ ہی کو کھڑا کیا۔

اس بار راجیش کھنہ کے مدمقابل بھی ایک فلمی اداکار ہی تھے...اور وہ تھے شتروگھن سنہا۔دونوں ہی اداکار جب اپنے انتخابی جلسوں سے خطاب کرتے تو حاضرین ان سے ان کا سیاسی پروگرام پوچھنے کی بجائے یہی فرمائشیں کرتے کہ اپنی فلاں فلم کا فلاں ڈائیلاگ سنا دیجیے، فلاں ایکشن کر کے دکھا دیجیے۔بہر حال، ضمنی الیکشن میں شتروگھن سنہا کے مقابلے میں راجیش کھنہ جیت گئے۔یوں انہیں فلمی دنیا کے بعد سیاسی میدان میں بھی کامیابی نصیب ہو گئی حالانکہ وہ اس بار بھی ڈر رہے تھے کہ کہیں ہار نہ جائیں۔

الیکشن جیتنے کا نہ تو خود راجیش کھنہ کو کوئی فائدہ ہوا اور نہ ہی ان کے ووٹرز کو۔راجیو گاندھی کی موت نے بھی ان کے لیے سیاسی طور پر ابھرنے کے مواقع کم کر دیئے۔رکن پارلیمنٹ کے طور پر انہیں پتا چلا کہ سیاست کے راستے بہت دشوار ہیں۔وہ اپنے حلقے کا ترقیاتی فنڈ تک استعمال نہیں کر پائے۔نتیجہ یہ کہ 1996ء میں جب اگلے الیکشن ہوئے تو راجیش کھنہ بی جے پی کے جگ موہن کے مقابلے میں 58، ہزار ووٹوں کے فرق سے ہار گئے۔اس کے بعد راجیش کھنہ نے سیاست سے توبہ کر لی اور مستقل طور پر بمبئی لوٹ آئے جس کا نام اس وقت تک تبدیل ہو کر ممبئی ہو چکا تھا۔بمبئی کا نہ صرف نام بدلا تھا بلکہ فلم انڈسٹری کے حالات میں بھی بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں۔

راجیش کھنہ کے پاس اب کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔راجیش کھنہ کی آخری فلم ”آ اب لوٹ چلیں“ تھی جو رشی کپور کی بطور ڈائریکٹر پہلی فلم تھی اور وہ بھی فلاپ ہو گئی تھی۔

ایک بار تو انہوں نے اپنے ایک، اداکار اور ٹی وی پروڈیوسر دوست دھیرج کمار سے کہہ بھی دیا۔”یار! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔مجھے پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔پیسہ میرے پاس اوپر والے کی مہربانی سے بہت ہے... لیکن مجھ سے بیکار نہیں بیٹھا جاتا۔“

دھیرج کمار فوری طور پر تو راجیش کھنہ کے لیے کچھ نہ کر سکا تاہم اس نے اس سلسلے میں سوچ بچار کرنے کا وعدہ کیا۔

(جاری ہے)

itsurdu.blogspot.com
راجیش کھنہ کی داستانِ حیات
اب صرف
تنہائیاں اُن کی ساتھی تھیں
itsurdu.blogspot.com

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

قسط:20

آخر کار دھیرج کمار نے راجیش کھنہ کو لے کر ایک ٹی وی سیریل بناڈالی۔ حالانکہ راجیش کھنہ نے اس میں نہایت سنجیدگی اور ذمے داری سے کام کیا، وہ وقت پر شوٹنگ کے لئے پہنچ جاتے، پوری توجہ سے اسکرپٹ دیکھتے، ان کا کام بھی نہایت عمدہ تھا لیکن وہ سیریل ناکام رہی۔ وہی نہیں، بلکہ اس کے بعد بھی کچھ لوگوں نے اس امید پر راجیش کھنہ کو کاسٹ کرکے دو تین سیریلز بنائیں کہ شاید ان کے نام پر وہ چل جائیں لیکن ان کی توقعات پوری نہ ہو سکیں۔

مایوسی کے عالم میں راجیش کھنہ نے تیسرے درجے کی ایک فلم ”وفا“ میں بھی کام کر لیا، جس میں ان کے مقابل ایک کم عمر لڑکی ہیروئن تھی۔ راجیش نے اس کے ساتھ کئی نہایت ”بولڈ“ مناظر بھی پکچرائز کرائے۔ فلم پھر بھی نہ چلی، البتہ وہ مناظر دیکھ کر راجیش کھنہ کے پرستاروں کے سر شرم سے جھک گئے۔ راجیش کھنہ شدید احساس تنہائی کے شکار اور اپنی بے کاری سے تنگ تھے لیکن ان کی انا انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ خود کسی پروڈیوسر کے پاس جا کر اس سے کام مانگیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا اسٹاف بھی کم ہوتا چلا گیا۔ ان کا منیجر پرشانت بھی جانے والوں میں شامل تھا۔ وہ سلیم خان (سلمان خان کے والد) کے ہاں ملازم ہو گیا۔

تاہم فون پر راجیش کھنہ کا پرشانت سے رابطہ رہا۔ ایک بار اس سے فون پر بات کرتے ہوئے راجیش نے طویل ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”اب تو تنہائیاں ہی اپنی ساتھی ہیں رے!“

2005ء میں ”فلم فیئر“ والوں نے انہیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا۔ رسالے کی منیجنگ ایڈیٹر میرا جوشی ان سے یہ پوچھنے گئیں کہ وہ ایوارڈ لینے آئیں گے یا نہیں؟ راجیش نے ہامی تو بھر لی لیکن ساتھ ہی کہا کہ ان کے ساتھ ان کے قریبی دس بارہ افراد ہوں گے، اس لئے انہیں پاس دے دیے جائیں۔ انہیں دس بارہ پاس دے دیے گئے لیکن جب وہ ایوارڈ کی تقریب میں آئے تو تنہا تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ انہیں امیتابھ بچن کے ہاتھ سے ایوارڈ دلوایا گیا۔ ایوارڈ لینے کے بعد اپنی مختصر سی تقریر کے آخر میں راجیش کھنہ نے یہ مصرع پڑھا ”وہ بھی اِک دور تھا، یہ بھی اِک دور ہے۔“

ان دنوں یہ مصرع راجیش کھنہ کا پسندیدہ ہو گیا تھا اور وہ اکثر موقعوں پر اسے دہراتے تھے۔ 2006ء میں ان پر یہ وقت بھی آیا کہ ٹیکس کے کچھ جھگڑوں کی وجہ سے انکم ٹیکس کے محکمے نے ان کا بنگلہ ”آشیرواد“ سیل کر دیا۔

سرکاری تالے کے ساتھ بنگلہ سربہ مہر ہونے کی وجہ سے وہ اپنے دفتر میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ دفتر ایک کشادہ اپارٹمنٹ تھا جو ان کے دفتر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ ٹہلتے ہوئے ساحل سمندر پر ایک بینچ پر جا بیٹھتے جو ان کے بنگلے سے چند قدم کے فاصلے پر سڑک کے کنارے نصب تھی۔ وہ اس بینچ پر تنہا بیٹھے دیر تک، کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے بنگلے کی طرف دیکھتے رہتے۔ اپنے عروج کے زمانے میں وہ اس بنگلے کی ٹیرس پر کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کیا کرتے تھے۔

ماضی میں انہیں ٹیرس پر کھڑے دیکھ کر ذرا سی دیر میں نیچے ان کے پرستاروں کا ہجوم لگ جاتا تھا۔ راہ چلتے لوگ ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر بتاتے تھے ”وہ دیکھو... راجیش کھنہ کھڑے ہیں۔“ لیکن اب وہ اسی بنگلے کے سامنے دیر تک بینچ پر بیٹھے رہتے لیکن کوئی بھی انہیں دیکھ کر نہ رکتا اور نہ ہی کسی دوسرے کو بتاتا کہ، وہ دیکھو، اس بینچ پر راجیش کھنہ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ شاید اب انہیں کوئی پہچان ہی نہیں پاتا تھا۔ درحقیقت کوئی انہیں پہچاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ ہر شخص اچٹتی ہوئی سی ایک نظر ان پر ڈال کر، یا پھر ان کی طرف دیکھے بغیر ہی سر جھکا کر چلتا چلا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر بھی وہ زیر لب کبھی کبھار اپنا پسندیدہ مصرع دہراتے ”وہ بھی اِک دور تھا، یہ بھی اک دور ہے...!“

بعد میں انہوں نے تامل ناڈو میں اپنی ایک جائیداد بیچ کر انکم ٹیکس والوں کے واجبات ادا کر دیے تھے اور اپنا بنگلہ ”آشیرواد“ واگزار کرا لیا تھا اور دوبارہ اس میں منتقل ہو گئے تھے۔ جن دنوں وہ دہلی میں مقیم تھے اور سیاست میں حصہ لے رہے تھے، ان دنوں ایک چھوٹے موٹے سیاسی رہنما بھوپیش راسین نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ جب راجیش دوبارہ اپنے بنگلے میں منتقل ہوئے، ان دنوں راسین کا بیٹا ہرش، فلم ڈائریکٹر بننے کی آرزو دل میں سمائے ممبئی آ گیا۔ راجیش نے اسے نہ صرف بنگلے میں اپنے ساتھ رکھا بلکہ حسب مقدور اس کی مدد بھی کرنے کی کوشش کی۔

ہرش کا کہنا ہے ”ہو سکتا ہے ماضی میں راجیش انکل کا سلوک کچھ لوگوں سے اچھا نہ رہا ہو لیکن میرے ساتھ انہوں نے بہت مہربانی کا سلوک کیا۔ اس کے علاوہ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ملازمین پر بہت مہربان تھے اور ان کے ساتھ بہت ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔ اپنے مالی، ڈرائیور، خانساماں اور گھریلو ملازمہ کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے اور آڑے وقت میں ان کی ہر ممکن مدد کرتے۔ ایک بار ان کی ملازمہ کی بہن بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے اس کیلئے آپریشن تجویز کیا جس کے اخراجات کافی تھے، جبکہ اس کے گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ یہ بھی یاد رہے کہ وہ خود راجیش صاحب کی ملازمہ نہیں تھی، بلکہ ملازمہ کی بہن تھی۔ راجیش صاحب کو اس کے مسائل کا پتا چلا تو پہلے ڈرائیور کو بھیج کر اس کے گھر میں مہینے بھر کا راشن ڈلوایا۔ پھر خود اسپتال جا کر اس کا پورا بل ادا کیا۔“

راجیش کھنہ کے گھر میں اپنے قیام کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ہرش مزید بتاتا ہے۔ ”راجیش انکل کے گھر میں چھوٹا سا ایک سنیما ہال بھی تھا جس میں کبھی کبھی وہ مجھے ساتھ بٹھا کر اپنی کوئی پرانی فلم دیکھنے لگتے۔ ”امر پریم“ دیکھتے ہوئے تو وہ گویا ماضی میں کھو کر رہ گئے تھے۔ ایک سین پر وہ خود اپنے بارے میں بے اختیار بول اٹھے۔ ”ابے واہ...! کیا پرفارمنس دی ہے تو نے...!“ وہ شدید احساس تنہائی کا شکار تھے لیکن جن دنوں میں ان کے گھر میں رہ رہا تھا، ان دنوں ان کا احساس تنہائی کچھ کم ہو گیا تھا۔“

اسی زمانے میں انیتا ایڈوانی نامی ایک عورت نے دعویٰ کر دیا تھا کہ وہ بھی ”آشیرواد“ میں راجیش کھنہ کے ساتھ رہتی ہے اور دکھ بیماری یا تنہائی کے لمحات میں صرف اسی نے راجیش کھنہ کا خیال رکھا ہے اور دیکھ بھال کی ہے، باقی سب لوگ ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس حوالے سے اس خاتون کے کئی انٹرویو بھی اخباروں اور رسالوں میں چھپ گئے۔ راجیش کے ساتھ اس کی چند تصویریں بھی موجود تھیں۔ راجیش نے جب وہ انٹرویوز پڑھے تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے سختی سے اس بات کی تردید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ انیتا ایڈوانی دو چار مرتبہ صرف پرستار کے طور پر ان سے ملی تھی اور اب اس ڈھلتی عمر میں کوئی عورت ان کے ساتھ ان کے بنگلے میں نہیں رہ رہی تھی۔ ہرش نے بھی ان کے اس بیان کی تائید کی اور کہا کہ اس نے اپنے خاصے طویل قیام کے دوران ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کے سوا کسی عورت کو ”آشیرواد“ میں رہتے نہیں دیکھا، اور وہ ملازمہ بھی سرونٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔

2011ء کے آغاز میں فلم ڈائریکٹر اشوک تیاگی نے راجیش کھنہ کو اپنی فلم ”ریاست“ میں کاسٹ کیا۔ اس میں راجیش کا رول کچھ اسی قسم کا تھا جیسا ”گاڈ فادر“ میں مارلن برانڈو اور فلم ”سرکار“ میں امیتابھ بچن کر چکے تھے۔

راجیش نے ان دونوں فلموں کی ڈی وی ڈیز منگوا کر بڑی توجہ سے دیکھیں اور فروری میں جب ”ریاست“ کی شوٹنگ شروع ہوئی تو بڑی محنت اور لگن سے کام شروع کیا لیکن جون 2011ء میں اچانک ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔ اشوک تیاگی ان کی عیادت کے لئے آئے تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے تھے۔

دراصل ان کی بلانوشی رنگ لے آئی تھی۔ انہیں جگر کے کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ جب ڈاکٹر نے انہیں یہ بات بتائی تو چند لمحوں کے لئے وہ گم صم سے ہو گئے، لیکن پھر گویا حوصلے سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

”اس کا مطلب ہے اب مجھے اصل زندگی میں بھی اپنی فلم ”آنند“ والا رول ادا کرنا ہو گا۔“

”آنند“ میں راجیش کھنہ نے آنند ہی کا رول کیا تھا جو فلم کے اختتام پر کینسر میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے۔ جب حقیقی زندگی میں راجیش کھنہ میں اس مرض کی تشخیص ہو گئی تو انڈیا میں اور انڈیا سے باہر کئی قابل ڈاکٹروں سے علاج کے لئے رجوع کیا گیا لیکن سب نے یہی کہا کہ اب علاج ممکن نہیں تھا اور وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیں گے۔ یہ جاننے کے بعد راجیش کھنہ 18 ماہ زندہ رہے اور یہ عرصہ انہوں نے بڑی ہمت اور حوصلے سے گزارا۔

کسی نے کبھی انہیں اداس یا روتے نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے کبھی کسی سے اپنی کسی تکلیف کا ذکر کیا۔ الٹا وہ ان دنوں زیادہ خوش مزاج ہو گئے تھے۔ زیادہ ہنسنے لگے تھے۔ ان کے اندر بہرحال ایک اداکار موجود تھا اور شاید وہ اب اس سے فلم کے سیٹ پر کام لینے کے بجائے زندگی کے اسٹیج پر کام لے رہے تھے۔ انہوں نے اشوک تیاگی سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ جلدی اپنی فلم مکمل کر لے۔ شاید وہ مرنے سے پہلے ایک بار پھر اپنے گرد پرستاروں کا ہجوم دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جب بھی ڈاکٹر کے پاس جاتے تو مسکراتے ہوئے اس سے پوچھتے۔ ”میرا ویزا کب ختم ہو رہا ہے؟“

اس مشکل وقت میں ان کی فیملی ان کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ ڈمپل اور دونوں بیٹیاں آ کر ان کے ساتھ رہنے لگیں۔ اکشے کمار بھی زیادہ سے زیادہ وقت ”آشیرواد“ میں گزارنے کی کوشش کرتے۔ پھر ڈمپل اور بچیوں نے پروگرام بنایا کہ راجیش کھنہ کی 69ویں سالگرہ 29 دسمبر 2011ء کو گوا میں منائی جائے اور وہیں نئے سال کا استقبال بھی کیا جائے۔ راجیش نے دہلی میں اپنے سیاسی دور کے دوست بھوپیش راسین کو فون کیا اور بڑے اصرار سے اپنے ساتھ گوا چلنے کی دعوت دی۔

بھوپیش ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ وہ بولے۔ ”کاکا جی! آپ کو پتا ہے، نئے سال کی خوشی، میں اپنی فیملی کے ساتھ مناتا ہوں۔“

اس پر راجیش غصے میں آ گئے چیخ کر بولے۔ ”تمہیں پتا ہے کہ یہ شاید میری آخری سالگرہ ہو۔ اس کے باوجود تم انکار کر رہے ہو...“

ان کی آواز بھرا گئی۔ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکے اور انہوں نے فون بند کر دیا۔ دوسری طرف بھوپیش الجھن میں تھے کہ کیا کریں۔ دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ راجیش کا فون آ گیا۔ انہوں نے پچھلی مرتبہ چیخ کر بات کرنے پر بھوپیش سے معذرت کی۔ اب ان کا لہجہ بالکل دھیما اور نارمل تھا۔ اس وقت تک بھوپیش بھی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے راجیش کو بتا دیا کہ وہ ان کے ساتھ گوا چلیں گے۔

گوا میں ان سب نے بہت خوشگوار وقت گزارا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ایک بہت خوش و خرم فیملی پکنک منانے آئی ہوئی ہے۔ راجیش بھی سب کے ساتھ ہر تفریحی سرگرمی میں حصہ لیتے اور بہت خوش نظر آتے لیکن کبھی کبھی اچانک خاموش ہو جاتے اور نہ جانے کن خیالوں میں کھو جاتے۔ تب ایسا لگتا کہ ذہنی طور پر وہ کہیں دور چلے گئے ہیں، شاید یادوں کی بھول بھلیوں میں کہیں بھٹک رہے ہیں۔

وہ گوا سے گھر واپس آئے تو بستر کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے کہیں بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ صرف چیک اپ کے لئے جاتے۔ بات بھی بہت کم کرتے۔ وہ بہت تکلیف میں تھے اور بولنے سے بھی ان کی تکلیف بڑھ جاتی تھی لیکن وہ کسی سے اپنی تکلیف کے بارے میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ ان کا جسم گویا روز بہ روز سکڑتا جا رہا تھا اور وہ ڈھانچا ہو کر رہ گئے تھے۔ (جاری ہے)

راجیش کھنّہ کی داستانِ حیات
ایسا لگتا تھا جیسے وہ ساری دُنیا سے
ناراض ہیں
itsurdu.blogspot.com

بیماری نے راجیش کھنہ کو بے حد کمزور کر دیا تھا، تاہم کبھی کبھار کسی قریبی جاننے والے کے اصرار پر وہ کسی تقریب میں چلے جاتے تھے۔ ایوارڈز کی ایک تقریب میں ان کا سامنا سلیم خان (سلمان خان کے والد) سے ہو گیا۔ انہوں نے بہت عرصے سے راجیش کھنہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو راجیش کھنہ انہیں ایک بالکل ہی مختلف انسان نظر آئے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ انہیں راجیش کھنہ کی حالت دیکھ کر دھچکا لگا تھا۔ انہوں نے خود اپنے الفاظ میں اس واقعے کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔ ”ان دنوں میں زیادہ تر اپنے فارم ہاؤس میں رہ رہا تھا اور میرا ممبئی آنا جانا کم ہی ہوتا تھا۔ اس لئے بہت عرصے سے میرا راجیش کھنہ سے سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس روز ایوارڈ کی تقریب میں انہیں دیکھا تو میں انہیں پہچان نہیں سکا، اس لئے میں ان کے قریب بھی نہیں گیا۔ پھر کسی نے ان کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ وہ راجیش کھنہ ہیں۔ میں حیران رہ گیا۔ چند لمحے تک تو مجھے یقین ہی نہ آیا۔ جب میں نے انہیں پہچانا تو ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ بیمار ہیں۔

میں نے سوچا، اگر وہ بیمار ہیں تب تو ان سے ضرور ملنا چاہئے، ان کا حوصلہ بڑھانا چاہئے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ انہیں کوئی معمولی بیماری نہیں ہے اور وہ شاید روز بروز گھلتے جا رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا کہ اب وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہیں گے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے رنجش تھی لیکن اس موقع پر میں نے سوچا کہ یہ دل میں رنجش رکھنے کا وقت نہیں ہے، تاہم میں اس تقریب میں ان سے نہیں ملا۔ مجھے اس رات اپنے فارم ہاؤس واپس جانا تھا لیکن میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔

پرشانت کمار جو پہلے کبھی راجیش کھنہ کے سیکرٹری ہوا کرتے تھے اور بیس سال ان کے ساتھ کام کر چکے تھے، ان دنوں میرے پاس کام کر رہے تھے۔ میں نے گھر آ کر ان سے کہا کہ مجھے کل راجیش کھنہ کے گھر لے چلنا، میں ان سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم پہلے ان سے فون پر یا گھر جا کر پوچھ لو کہ سلیم صاحب آنا چاہتے ہیں۔ پرشانت نے جا کر ان سے پوچھا تو انہوں نے الٹا سوال کر ڈالا کہ وہ کیوں آنا چاہتے ہیں؟ اس کے بعد پرشانت نے مزید کوئی بات نہیں کی اور یوں یہ ملاقات نہیں ہو سکی۔“

اداکار پریم چوپڑا جو کہ ایک اچھے ولن کے طور پر زیادہ پہچانے جاتے ہیں، وہ راجیش کھنہ کے ساتھ تقریباً 20 فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ راجیش کی بیماری کے زمانے میں ہی ان کی بھی راجیش سے ملاقات ہوئی۔ وہ بتاتے ہیں۔ ”میرا ایک پارٹی میں ان سے سامنا ہوا، میں نے گرمجوشی سے انہیں گلے لگایا لیکن انہوں نے بہت ہی سرد مہری کا اظہار کیا، جس پر میں بہت شرمندہ ہوا۔ مجھے یہ تو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بیمار ہیں لیکن ایسا لگتا تھا کہ بیمار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ساری دنیا سے ناراض ہیں یا پھر شاید وہ اپنے آپ سے ناراض تھے۔ دکھ، سکھ، بیماری، تنگدستی، خوشحالی، شہرت، گمنامی...! یہ سب چیزیں اوپر والے کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اگر انسان بیمار ہو جائے تو اس میں دوسروں سے ناراض ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ بہر حال...! ان کے رویے پر میں دیر تک اداس رہا۔“

اس میں شک نہیں کہ بیماری کے اس زمانے میں راجیش کھنہ نے اپنے آپ کو دوسروں سے دور کر لیا تھا، لیکن اسی زمانے میں انہیں ایک بڑی اور نہایت مشہور ایڈورٹائزنگ کمپنی کی طرف سے ایک کمرشل کی آفر کی گئی۔ اس اشتہاری فلم کا بنیادی خیال یا آئیڈیا کچھ ایسا تھا... یا شاید جان بوجھ کر ایسا رکھا گیا تھا کہ راجیش کھنہ اس میں بہت اچھی طرح فٹ بیٹھتے تھے۔ راجیش کھنہ نے اپنے عروج کے زمانے میں کسی اشتہاری فلم میں کام نہیں کیا تھا، چنانچہ اب جبکہ وہ دنیا سے تقریباً کٹ چکے تھے، یہ امید نظر نہیں آتی تھی کہ وہ کسی کمرشل میں کام کریں گے۔

امیتابھ بچن کی ایوارڈ یافتہ فلم ”پا“ کے ڈائریکٹر آر بالکی اس زمانے میں اشتہاری فلموں کے ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے، وہی یہ اشتہاری فلم بنا رہے تھے۔ فلم کا مرکزی خیال انہی کا تھا اور یہ تجویز بھی انہی کی تھی کہ اس میں راجیش کھنہ سے کام لیا جائے۔ شاید انہوں نے اسکرپٹ بھی راجیش کھنہ کو ذہن میں رکھ کر لکھا تھا۔ اس اشتہاری فلم کی مختصر سی کہانی فلموں کے ایک سپر اسٹار کے بارے میں تھی، جس نے زبردست عروج کا زمانہ دیکھا تھا۔ اپنے زوال کے زمانے میں وہ اپنے عروج اور مقبولیت کے دور کو یاد کرتے ہوئے بڑے مان سے کہتا ہے۔ ”میرے فین مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“ دراصل یہ اشتہاری فلم پنکھوں کے بارے میں تھی اور اس میں لفظ ”فین“ کو مداح یا پرستار کے بجائے پنکھے کے لئے استعمال کر کے ایک سین فلم کے آخر میں تخلیق کیا گیا تھا۔ اس منظر کی شوٹنگ بنگلور کے ایک اسٹیڈیم میں ہونی تھی۔ جب اس فلم کیلئے راجیش کھنہ سے بات کی گئی اور آئیڈیا انہیں سنایا گیا تو خلاف توقع وہ اس میں کام کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ گو کہ ان کی صحت انہیں سفر کی اجازت نہیں دیتی تھی اور ان کے ڈاکٹر بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے بنگلور پہنچ کر اسٹیڈیم میں شوٹنگ کیلئے ڈیٹس بھی دے دیں۔

جب شوٹنگ کی ڈیٹس قریب آئیں تو راجیش کھنہ کی صحت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ گھر میں ہی گر جانے کی وجہ سے ان کی ٹانگ میں معمولی سا فریکچر ہو گیا۔ یہ فریکچر تو ایکسرے میں بال جیسا باریک نظر آیا تھا لیکن اس کی تکلیف زیادہ تھی۔ ٹانگ پر ورم بھی آ گیا تھا اور راجیش کیلئے چلنا تو کیا، کھڑے ہونا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وہ جوتے بھی خود نہیں پہن سکتے تھے لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ ڈیٹس دے چکے ہیں تو شوٹنگ کیلئے بنگلور ضرور جائیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ وعدہ بہر حال وعدہ ہوتا ہے۔ دو دن وہ اسپتال میں رہے، جہاں انہیں درد کم کرنے والی دوائیں خوب دی گئیں اور دو دن بعد وہ گھر آنے کے بجائے اسپتال سے ہی سیدھے بنگلور جانے کیلئے ایئر پورٹ روانہ ہو گئے۔

ان کے سیاسی دوست بھوپیش راسین ان کے ساتھ تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر راجیش کھنہ ایک کمرشل کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے تھے کہ اس کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ اشتہاری فلم ایک طرح سے راجیش کھنہ کیلئے خراج عقیدت بھی تھی۔ اس کے شروع میں راجیش کھنہ کی انتہائی مقبول فلموں کی جھلکیاں چلنی تھیں، پس منظر میں ان کی فلم ”کٹی پتنگ“ کا گانا ”یہ شام مستانی“ چلنا تھا اور انہیں اس پر اپنے پرانے مخصوص انداز میں اداکاری کرتے ہوئے اسٹیڈیم میں نمودار ہونا تھا۔ آخر میں انہیں یہ مکالمہ بولنا تھا۔ ”میرے فین مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“ اس کے ساتھ ہی کیمرے کو اسٹیڈیم کا منظر دکھانا تھا جہاں نشستوں پر تماشائیوں کے بجائے اس کمپنی کے ہزاروں پنکھے کھڑے نظر آتے جس کی وہ اشتہاری فلم تھی۔

شوٹنگ کے دن راجیش کھنہ لنگڑاتے ہوئے اپنے ہوٹل کے کمرے سے اپنی وینٹی وین تک پہنچے۔ ایک طرف ان کی ٹانگ میں فریکچر تھا، دوسری طرف وہ کینسر سے لڑنے میں اپنی توانائی کا ہر قطرہ صرف کر رہے تھے۔ وینٹی وین انہیں اسٹیڈیم کے گیٹ تک لے گئی، باقی فاصلہ انہیں پیدل طے کرنا تھا جو ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں وہیل چیئر پر اندر لے جایا گیا۔ اندر پہنچ کر وہ چند لمحے کھوئی کھوئی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بھوپیش کو بتانے لگے۔ ”1971ء میں میری فلم ”انداز“ ریلیز ہوئی تھی، اس کے بعد میں یہاں آیا تھا تو یہ اسٹیڈیم میرے مداحوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب میں ان کے سامنے آیا تو وہ خوشی اور جوش سے گویا دیوانے سے ہو گئے، نعرے لگانے لگے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس روز پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ اسٹار ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جن لوگوں نے مجھے وہ عزت، وہ پیار دیا تھا، آج میں انہی کی خاطر ان کے اس شہر اور اس اسٹیڈیم میں آیا ہوں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہلی بار صحیح معنوں میں میری پہچان بنی تھی۔“

اس روز ایک بار پھر راجیش کھنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کیونکہ اسٹیڈیم خالی پڑا تھا، کرسیوں پر صرف ایک کمپنی کے ہزاروں پیڈسٹل فین کھڑے تھے۔ راجیش کھنہ کے جیتے جاگتے ”فین“ آج اسٹیڈیم میں نہیں تھے۔ آج راجیش کھنہ کو انہی بجلی کے پنکھوں کو اپنے ”فین“ کہنا تھا لیکن بھوپیش کو پتا چل گیا تھا کہ اپنی انتہائی خراب صحت کے باوجود راجیش کھنہ نے بنگلور آنے کے لئے کیوں ہامی بھری تھی۔ یہاں سے ان کے عروج کا سورج طلوع ہوا تھا اور آج یہیں یہ سورج ڈوبتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دائرے میں زندگی کا سفر ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

پھر وہی مخصوص آوازیں گونجیں جو شوٹنگ کے وقت گونجتی ہیں۔ ”لائٹ... ساؤنڈ... کیمرا... ایکشن...!“

ڈائریکٹر آر بالکی اس وقت کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”میرے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس نے شہرت کا مزا اس طرح چکھا تھا کہ شاید ہی کسی نے چکھا ہو۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے ان گنت نوجوان لڑکیاں مری جاتی تھیں۔ وہ اسے اپنے خون سے خط لکھتی تھیں۔ آج وہ اپنے آپ پر نہ جانے کس طرح ضبط کر کے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کیلئے سیدھے کھڑے ہونا بھی مشکل تھا۔ بیماری نے اسے ڈھانچا بنا دیا تھا اور اس کی ٹانگ میں سخت تکلیف تھی۔ وہ کئی پین کلر گولیاں کھانے کے بعد کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی چالیس سال پہلے والا راجیش کھنہ ہے جو کسی ہجوم کی طرف دیکھ کر ہاتھ بھی ہلا دیتا تھا تو پورا ہجوم گویا خوشی سے دیوانہ ہو جاتا تھا۔ میں اس شخص پر کیمرا فوکس کئے ہوئے تھا جو کیمرے کے ایک ایک زاویے اور اس کے ایک ایک کل پرزے سے واقف تھا۔“

اس تکلیف اور نقاہت کے عالم میں بھی راجیش کھنہ کسی نہ کسی طرح اپنے مخصوص فلمی انداز میں چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ پس منظر میں گانا چل رہا تھا ”یہ شام مستانی“ اس کے پس منظر میں ان کی مشہور فلموں کی جھلکیاں چلنی تھیں۔ پھر انہوں نے کیمرے کے سامنے اپنے مکالمے بولے۔ ”فینز کیا ہوتے ہیں، مجھ سے پوچھو... پیار کا وہ طوفان... محبت کی وہ آندھی... وہ جذبات، وہ جنون... ہوا بدل سکتی ہے لیکن فینز...؟ یہ سب فینز میرے رہیں گے، میرے فینز مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“

اور پھر کیمرا پنکھوں پر چلا گیا۔ ڈائریکٹر آر بالکی بتاتے ہیں۔ ”کیمرا آن ہوتے ہی راجیش کھنہ گویا اپنی تکلیف، اپنی بیماری سب کچھ بھول گئے۔ ان میں گویا نئی جان آ گئی۔ کیمرا ان کی زندگی تھا۔ انہوں نے نہایت عمدگی سے اپنا کام مکمل کرایا۔ شام سات بجے شوٹنگ پیک اپ ہوئی تو ہمارے پورے یونٹ نے احتراماً کھڑے ہو کر انہیں سلامی دی۔ راجیش کھنہ نے ان سب کی طرف اور پھر کیمرے کی طرف دیکھ کر یوں ہاتھ ہلایا، جیسے کیمرے کو بھی الوداع کہہ رہے ہوں۔ انہوں نے ایک ٹکڑا ایسا بھی پکچرائز کرایا تھا جو ہمیں کمرشل میں استعمال نہیں کرنا تھا۔ اس میں انہوں نے اس گانے پر اپنی جوانی کے زمانے کی طرح ڈانس کرنے کی کوشش کی تھی۔ ”اچھا...! تو ہم چلتے ہیں“ یہ بات وہ گویا ہم سب سے اور کیمرے سے بھی کہہ رہے تھے۔“

پھر راجیش کھنہ اپنی وہیل چیئر پر بیٹھ گئے اور یکدم ہی وہ بہت تھکے تھکے دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے ایک الوداعی سی نظر اسٹیڈیم پر ڈالی، پھر شاید اپنی آنکھوں میں چھلک آنے والی نمی کو چھپانے کیلئے انہوں نے دھوپ کا چشمہ لگا لیا۔ شاید انہیں خود بھی احساس تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری شوٹنگ مکمل کرائی ہے۔ یہ اشتہاری فلم اپریل 2012ء میں ریلیز ہوئی تو اس پر کئی طرح کا رد عمل سامنے آیا۔ ہر رد عمل میں بڑی شدت تھی۔ بہت سے پرستاروں نے برا منایا کہ ان کی جگہ فلم میں پنکھے دکھا کر گویا ان کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

(جاری ہے)

itsurdu.blogspot.com
راجیش کھنہ کی داستانِ حیات
موت کی افواہوں سے
اُن کی مقبولیت واپس آگئی
itsurdu.blogspot.com

راجیش کھنہ کی داستانِ حیات

آخری قسط

بہت سے لوگوں کو راجیش کھنہ کی موجودہ حالت دیکھ کر سخت دھچکا لگا۔ انہیں یقین نہ آیا کہ یہ وہی راجیش کھنہ تھے جن پر ان گنت لڑکیاں مرتی تھیں اور بے شمار لڑکے رشک کرتے تھے۔ ایک وجیہ، شوخ، کھلنڈرے اور تندرست و توانا راجیش کھنہ کی جگہ ان کے سامنے سفید داڑھی والا ایک نحیف و ناتواں سا شخص تھا جس کا سوٹ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لگ رہا تھا اور جو موٹے عدسوں والی، نظر کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ لوگ یہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ راجیش کھنہ نے یہ مختصر سی اشتہاری فلم پکچرائز کرانے کیلئے اپنی قوتِ ارادی سے نہ جانے کتنا کام لیا تھا اور اندر ہی اندر خاموشی سے نہ جانے کتنی تکلیف اٹھائی تھی۔ بعض لوگوں کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ وہ اس حالت میں کیمرے کے سامنے آگئے تھے۔ یہ بھی ایک لحاظ سے بڑی جرأت کا کام تھا۔ بہت سے سپر اسٹارز بڑھاپے اور بیماری میں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ انہیں اس حالت میں دیکھیں، اس لئے وہ کیمرے کے سامنے نہیں آتے۔

پنکھوں کی اشتہاری فلم میں راجیش کھنہ کی حالت دیکھ کر جہاں ان کے مداحوں کو دھچکا لگا وہیں انہیں بھولے بسرے راجیش کھنہ اور ان کا سنہرا دور بھی یاد آ گیا۔ انہی کی وجہ سے بہرحال لوگوں کی توجہ اس کمپنی کے پنکھوں کی طرف بھی مبذول ہوئی اور ان کی فروخت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ یوں راجیش کھنہ کو لے کر اشتہاری فلم بنانا اس کمپنی کے لئے فائدہ مند رہا۔

کینسر راجیش کھنہ کو روز بہ روز کھائے جا رہا تھا۔ بیماری کا انکشاف ہونے کے بعد ابتدا میں تو راجیش کھنہ نے زندہ دلی اور خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ وہ خوفزدہ نہیں تھے اور نہ ہی اپنی تکلیف کا اظہار کرتے تھے۔ بس، وہ گویا کسی اور ہی دنیا میں رہنے لگے تھے۔ اپنی دونوں بیٹیوں کے لئے ان کی محبت اب پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ان کی خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ بیٹیاں زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزاریں۔

ڈمپل کپاڈیا نے بلاشبہ ان کی بہت خدمت کی اور ان تکلیف دہ ایام کو ان کے لئے آسان بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب راجیش کھنہ کے لئے وصیت تحریر کرنے کا مرحلہ آیا تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے ڈمپل کی طرف دیکھا۔ ڈمپل نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔ جو کچھ بھی آپ دینا چاہیں، اپنی بیٹیوں کو دیں۔“

راجیش نے اب غالباً یہ خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ ایک بار پھر ان کے گرد ان کے پرستاروں کا ہجوم ہوا کرے گا اور ان کا کوئی ایسا کام سامنے آجائے گا کہ وہ ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح مقبول اور مشہور ہو جائیں گے۔ انہیں غالباً یقین آگیا تھا کہ اب ایسا کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ انہیں شاید یہ حقیقت بھی یاد آچکی تھی کہ ساری دنیا، اور خصوصاً فلم انڈسٹری میں چڑھتے سورج کی پوجا ہوتی تھی اور وہ بہرحال اب چڑھتا ہوا نہیں، بلکہ ڈوبتا ہوا سورج تھے۔ وہ اکثر بالکل خاموش رہتے۔ اپنے ارد گرد کھڑے یا بیٹھے لوگوں کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھار نہایت کمزور سی آواز میں ایک دو جملے بولتے۔

ان کی اشتہاری فلم ریلیز ہونے کے کچھ عرصے بعد ان کی طبیعت خاصی خراب ہو گئی۔ انہیں لیلاوتی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ان کے خاندان کے لوگوں نے ابھی تک میڈیا وغیرہ کو نہیں بتایا کہ راجیش کینسر میں مبتلا ہیں۔ لوگ بس خود ہی مختلف اندازے لگاتے رہتے تھے یا پھر طرح طرح کی افواہیں پھیلتی رہتی تھیں۔ انہیں اسپتال میں داخل کرائے جانے کے بارے میں بھی ان کے کنبے نے میڈیا کو کوئی خبر نہیں دی، لیکن نہ جانے کس طرح 16 جون 2012ء کو خبر پھیل گئی کہ راجیش کھنہ بستر مرگ پر ہیں۔ فیس بک اور ٹوئٹر پر تو لوگوں نے یہ خبر اڑا دی کہ راجیش کھنہ انتقال کر چکے ہیں۔

ان کی فیملی کے لوگوں کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ان کے انتقال کی افواہ یا خبر ملک میں اتنی ہلچل مچائے گی۔ راجیش کھنہ کے بیمار ہونے کے بعد سے ان کا کسی بھی حلقے میں کوئی خاص تذکرہ نہیں تھا لیکن ان کی موت کی افواہ اڑی تو مختلف دفاتر میں ٹیلیفون کالز کا تانتا بندھ گیا اور میڈیا کے پچاسوں نمائندے لیلاوتی اسپتال کے سامنے آن جمع ہوئے۔ راجیش کے انتقال کی افواہ پر یہ ردعمل غیر معمولی تھا کیونکہ پچھلے ایک آدھ سال کے دوران ماضی کے کئی معروف ایکٹر یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہوئے تھے لیکن ملک میں یا میڈیا میں کوئی خاص ہلچل دیکھنے میں نہیں آئی تھی، جبکہ راجیش کھنہ کے بارے میں درست خبر جاننے اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے میڈیا کے تمام نمائندے بے قرار تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ راجیش کھنہ کی زندگی کا آخری باب ابھی چل رہا تھا یا پھر کتاب حیات کا آخری ورق بھی پلٹا جا چکا تھا۔

راجیش کھنہ کی زندگی کے بعض پہلو واقعی عجیب تھے۔ وہ بیٹے تو نند لال کھنہ کے تھے لیکن انہیں پالا ان کے تایا چُنی لال کھنہ اور تائی لیلاوتی کھنہ نے تھا، جنہیں راجیش کھنہ نے زندگی بھر چاچی جی کہہ کر پکارا۔ نند لال کھنہ کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے... جبکہ چُنی لال کھنہ کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے چھوٹے بھائی نند لال کھنہ نے اپنا ایک بیٹا (راجیش کھنہ) انہیں دے دیا تھا۔ پیدائش کے بعد راجیش کھنہ کا نام جتیندر کھنہ رکھا گیا تھا اور اختصار سے انہیں جتن کہا جاتا تھا۔

یہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد کس طرح ان کا نام تبدیل ہوا تھا۔ وہ پیدا لاہور میں ہوئے تھے لیکن تقسیم ہند کے آثار پیدا ہوئے اور لاہور میں ہندوؤں کو اپنی سلامتی خطرے میں محسوس ہوئی تو پورا کھنہ خاندان امرتسر چلا گیا۔ پھر راجیش کھنہ کے منہ بولے والد نے ریلوے کے ٹھیکیدار کی حیثیت سے ممبئی میں اپنا کام جما لیا تو بیوی اور منہ بولے بیٹے کو بھی وہیں لے گئے۔ راجیش کو معلوم تھا کہ چنی لال اور لیلاوتی کھنہ ان کے حقیقی والدین نہیں ہیں لیکن انہوں نے راجیش کی جس طرح پرورش کی تھی، اس کی وجہ سے راجیش نے ہمیشہ انہیں ہی اپنے حقیقی والدین سمجھا۔ انہوں نے اپنے کسی انٹرویو میں بھی حقیقی والدین کا تذکرہ نہیں کیا۔ اب اسی شہر میں راجیش کی زندگی کی شام ہو رہی تھی۔ وہ زندگی جس میں بے شمار نشیب و فراز تھے۔ وہ زندگی جس نے راجیش کھنہ کو بہت کچھ سکھایا تھا۔

ان کے بارے میں میڈیا کو بتا دیا گیا کہ وہ بیمار ضرور ہیں، لیکن بہرحال ابھی زندہ ہیں، اس کے باوجود ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑتی رہیں اور خبریں بھی گھڑی جاتی رہیں۔ ان کی ایک قریبی جاننے والی صحافی خاتون اسپتال میں ان کے کمرے تک پہنچی تو راجیش نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد خاتون صحافی نے پوچھا۔ ”کاکا جی! موت سے ڈر تو نہیں لگ رہا؟“

راجیش بہ مشکل ذرا سا ہنس پائے۔ پھر نہایت کمزور سی آواز میں بولے۔ ”اری پگلی! موت سے کیا ڈرنا... وہ تو ہر ایک کو ایک نہ ایک دن آنی ہی ہے... بس... دل میں بہت سی کہانیاں ادھوری رہ گئیں... زندگی مہلت دیتی تو ابھی کچھ اور اچھی اچھی فلمیں بناتے... لیکن کیا کریں... وقت آگیا ہے... اب ہمیں جانا ہے... بہت سے کام ادھورے چھوڑ کر جانا ہے...“

صحافی خاتون رونے لگی اور راجیش کھنہ کی فیملی کے لوگ اپنے آنسو چھپانے کے لئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ راجیش کھنہ کے چہرے پر اس وقت ایسی نرمی اور لہجے میں ایسا گداز تھا جسے محسوس کرنے کا تجربہ اس سے پہلے شاید کسی کو نہیں ہوا تھا۔ راجیش کو نہیں معلوم تھا کہ اسپتال سے باہر ان کی موت کی افواہیں اڑی ہوئی تھیں، سیکڑوں لوگ ان کے بارے میں درست صورت حال جاننے کے لئے ان کے گھر اور اسپتال کے گیٹ پر جمع تھے۔ اسپتال میں قیام کے دوران راجیش کی حالت یہ تھی کہ اکثر وہ کافی دیر کے لئے بے ہوشی کی سی کیفیت میں چلے جاتے تھے۔

ان کے سیاسی دوست بھوپیش راسین نے بعد میں ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”20 جون 2012ء کو وہ اسی طرح بے ہوشی کی سی کیفیت سے باہر آئے تو ان کی بیٹی رنکی نے ان کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ ٹوئنکل گو کہ ان دنوں امید سے تھی لیکن وہ بھی کمرے میں موجود تھی۔ اکشے، ان کا بیٹا آرو بھی پاس کھڑا تھا۔ ڈمپل سرہانے کھڑی تھیں۔ میرا بیٹا ہرش، راجیش کے پیروں کی طرف کھڑا تھا۔ انجو مہندرو بھی تھیں۔ راجیش نے تھکی تھکی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھا، پھر نحیف آواز میں بولے۔ ”میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔“

ان کی فیملی نے انہیں گھر لے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ باہر بھی نہ جانے کس طرح یہ خبر پھیل گئی کہ راجیش کو اسپتال سے گھر لایا جا رہا ہے۔ جب راجیش اور ان کے گھر والوں کی گاڑیاں ”آشیر واد“ پہنچیں تو وہاں ہزاروں کا مجمع تھا، جس میں پرستاروں کے علاوہ اخباروں اور ٹی وی چینلز کے سیکڑوں رپورٹرز اور کیمرا مین بھی شامل تھے۔ راجیش کھنہ کی محض ایک جھلک دیکھنے کیلئے وہ سب کوشاں تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ راجیش کی تمنا پوری ہو گئی تھی اور ان کا مقبولیت کا دور لوٹ آیا تھا۔ انہیں دیکھنے کیلئے لوگوں کا ایسا سیلاب امڈ آیا تھا کہ کارٹر روڈ پر ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

ڈمپل اور اکشے کمار نے میڈیا سے بات کی اور بتایا کہ راجیش کی طبیعت اب بہتر ہے، اس لئے انہیں گھر لے آئے ہیں لیکن ہجوم میں نہ جانے کیوں افواہ گردش کرتی رہی کہ راجیش اب زندہ نہیں تھے۔ آخر کار لوگوں سے کہا گیا کہ کچھ دیر بعد وہ سب راجیش کھنہ کو ”آشیر واد“ کی اسی ٹیرس پر کھڑے دیکھ سکیں گے، جہاں کبھی کبھار ان کے عروج کے زمانے میں کھڑے دیکھا کرتے تھے۔ گاڑیاں اندر چلی گئیں۔ اس کے بعد ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ہجوم میں اضافہ ہوتا گیا۔

آخر کار تقریباً ایک گھنٹے بعد کُرتے پاجامے میں ملبوس، ایک نحیف و ناتواں راجیش کھنہ ٹیرس پر نمودار ہوئے۔ ان کے جھکے ہوئے کندھوں پر سرمئی شال تھی اور ان کے کمزور جسم پر ان کا لباس کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ وہ سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہجوم میں ایک شور برپا ہو گیا۔ لوگ نہ جانے کن کن الفاظ میں اور کیسے کیسے نعروں سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ راجیش کھنہ نے ان کی طرف دیکھ کر دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا۔

ان کے چہرے پر ایسی طمانیت پھیل گئی جیسے ان کے عروج کا زمانہ لوٹ آیا ہو۔ تاہم وہ زیادہ دیر ٹیرس پر کھڑے نہ رہ سکے۔ گھر والے انہیں جلد ہی واپس نیچے لے گئے۔ یہ سارا منظر ملک کے تمام ٹی وی چینلز پر لائیو ٹیلی کاسٹ ہوا۔ یوں ان افواہوں کا خاتمہ ہو گیا کہ راجیش کھنہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک بار پھر ٹی وی چینلز پر ان کی زندگی کے سفر اور ان کی کامیاب فلموں کی جھلکیاں دکھائی جانے لگیں۔ دوسرے روز کے تمام اخبارات کے صفحۂ اول پر ان کی وہ تصویر چھپی جس میں وہ اپنے بنگلے کی ٹیرس پر کھڑے وکٹری کا نشان بنا رہے تھے۔

ان کی وکٹری یا فتح صرف اتنی ہی تھی کہ ان کے پرستاروں، ان کے چاہنے والوں کا ہجوم ایک بار پھر انہیں دیکھنے کے لئے امڈ آیا تھا لیکن انسان خواہ کتنا ہی بڑا اسٹار، سپر اسٹار یا میگا اسٹار ہو، وہ کینسر یا موت کو تو شکست نہیں دے سکتا۔ موت کے سامنے وکٹری کا نشان بنانے سے کچھ نہیں ہوتا، شکست تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے۔ 22 جون کو انہیں ایک بار پھر لیلاوتی اسپتال لے جایا گیا۔ وہ بہت تکلیف میں تھے۔ دواؤں نے بھی گویا اثر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بس اتنا ہی اثر ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لئے وہ غنودگی میں چلے جاتے تھے۔

آنے والے تین ہفتوں کے دوران ان کے گھر والوں کو، انہیں کئی بار اسپتال لے جانا پڑا۔ ہر بار وہ طبیعت ذرا بہتر ہونے پر ضد کرتے کہ وہ گھر جانا چاہتے ہیں، وہ زندگی کے آخری لمحات اپنے گھر پر، اپنے کمرے میں گزارنا چاہتے ہیں۔ آخری بار انہیں 17 جولائی 2012ء کو لیلاوتی اسپتال سے گھر لایا گیا۔ وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ بار بار غشی کی سی کیفیت میں چلے جاتے تھے۔ بولنے سے بھی ان کی تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ اس حالت میں بھی اہل خانہ بہرحال مریض کو تسلیاں دیتے ہیں۔ ان سے بھی کسی نے کہا ”کاکا جی! آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“

راجیش کھنہ نے مضمحل انداز میں مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر انتہائی کمزور اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”شوٹنگ ختم ہو گئی... پیک اپ کی تیاری کرو...“

اپنے ایک انٹرویو میں راجیش کھنہ نے کہا تھا ”ایک بادشاہ مرتے وقت بھی بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس کے چاہنے والے اس کے ساتھ نہ ہوں، وہ تنہائی میں مر رہا ہو، کسی صحرا میں راستہ بھول کر اکیلا کہیں نکل گیا ہو اور موت نے اسے آن گھیرا ہو، چاہے وہ تخت پر بیٹھا ہو اور اس کا آخری وقت آگیا ہو، چاہے وہ جلاوطنی کی حالت میں جان دے رہا ہو... لیکن بادشاہ بہرحال بادشاہ ہی رہتا ہے۔“

فلمی دنیا کے اس بادشاہ نے بھی 18 جولائی 2012ء کی شام آنکھیں بند کیں تو پھر نہیں کھولیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ ان کی فلمیں رہ گئیں، ان گنت تصویریں رہ گئیں، آواز رہ گئی، عکس رہ گیا، یادیں رہ گئیں، وہ خود نہیں رہے۔ 19 جولائی کو دن چڑھے، دس بجے ”آشیر واد“ سے ان کا جنازہ نکلا۔ ان کی میت ایک کھلی گاڑی پر، شیشے کے تابوت میں رکھی گئی تاکہ وہ جم غفیر جو ان کے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، ان کی جھلک دیکھ سکے۔ نہ جانے کتنے لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، کتنے ہی تھے جو خاموشی سے آنسو بہا رہے تھے اور بہت سے ایسے تھے جن کی آنکھیں نم تھیں اور ان آنکھوں میں ان گنت دھندلائی ہوئی یادیں تھیں۔

زوردار بارش ہو رہی تھی مگر جنازے کے ساتھ چلنے والوں کی تعداد ہر قدم پر بڑھتی جا رہی تھی۔ پولیس کے کئی دستے ہجوم کو کنٹرول کرنے کے لئے موجود تھے۔ راجیش کی پوری فیملی اور بیسیوں غیر فلمی دوستوں کے علاوہ امیتابھ بچن، ابھیشیک بچن، راج ببر، منوج کمار، کرن جوہر، رانی مکرجی بھی جنازے کے جلوس میں شامل تھے۔ ”ولے پارلے شمشان گھاٹ“ میں راجیش کھنہ کے 9 سالہ نواسے نے ان کی چتا کو آگ دکھائی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے فلمی دنیا کا ایک اور بادشاہ راکھ ہو گیا، خاک ہو گیا، اس کی زندگی کی فلم ختم ہو گئی۔

(ختم شد)